جلد ۹۶ ستمبر ۱۹۸۱ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

اسلامی انقلاب کے چار مراحل :

دعوت و تبلیغ ○ تنظیم و تربیت

ہجرت واجتماعیت ○ جہاد و انقلاب

حضورِ اکرمؐ اور ہجرت

از : سیّد اسعد گیلانی

○ یہ کتاب آپ کو رسُولِ اکرمؐ کی داستانِ ہجرت سے روشناس کراتی ہے۔

● یہ اسلامی انقلاب کے نہایت اہم مرحلے سے متعارف کراتی ہے۔

○ وہ مرحلہ جو کھرے کو کھوٹے اور وفادار کو بے وفا سے جُدا کر دیتا ہے۔

یہ کتاب اسی مرحلے کی داستانِ دل پذیر اور انقلابی تربیت کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

ضخامت : ۲۱۲ صفحات ○ قیمت : ۲۰/ روپے

○ اس کتاب کے بغیر آپ کی لائبریری میں اب تک عظیم خلاء تھا
اس علمی خلاء کو پُر کیجیے !

ادارہ ترجمان القرآن ○ اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۶ | ستمبر ۱۹۸۱ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۱ھ | عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ---------- ۴۱۰۳۱۶

چندہ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

پردے کے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر غیر مخلوط معاشرت اور جداگانہ تعلیمی انتظام برائے خواتین کا تخیل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور اُن کے تحریکی رفیقوں نے مسلسل پیش کیا ہے۔ ایک ہی مقصد کے لیے جہاں ایک طرف خواتین کو انفرادی طور پر قانونِ حجاب کی پابندی کی دعوت دی جاتی تھی، وہاں دوسری طرف نگاہ اجتماعی ادارات پر بھی تھی، جو قوم میں بے پردہ یا باپردہ معاشرت پھیلانے کا ذریعہ بن سکتے تھے — مخلوط تعلیم کا پارٹ بے پردگی کو فروغ دینے میں بہت مؤثر رہا ہے۔ پھر اس کے ساتھ مخلوط تفریحی تقاریب، مخلوط ثقافتی مجالس، فنونِ لطیفہ کے مخلوط کلچرل شو، ان سارے عوامل نے مل جل کر ایک طوفان ہمارے معاشرے میں اُٹھا دیا۔

اصلاح کا عمل پورے کا پورا یکبارگی بعض دائروں میں چل جاتا ہے مگر بعض بگاڑ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے خلاف تدریجاً ایک ایک قدم آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے ہمارے حلقوں میں عرصہ سے "خواتین یونیورسٹی" کے قیام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

مارشل لا کی موجودہ حکومت نمودار ہوئی تو اُس کی سربراہی ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس سے ہمارے علماء اور عوام کو کسی قدر یہ اُمید ہونے لگی کہ شاید اُن اسلامی تقاضوں کا پورا ہونا اب ممکن ہے، جن کے خلاف کئی سابق حکمران برسرِ مخالفت رہے ہیں۔ اُمید کی اسی فضاء میں موجودہ حکومت کو مختلف اطراف سے کچھ اچھے مشورے دیے جاتے رہے۔

خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بھی یہ مشورہ دیا گیا کہ مخلوط تعلیم کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بڑے بڑے شہروں میں جامعاتِ خواتین کا قیام عمل میں لایا جائے اور قدمِ اوّل کے طور

پر لاہور اور کراچی میں کم سے کم دو یونیورسٹیاں ایسی قائم کر دی جائیں جو خواتین کے لیے خاص ہوں۔ اس سلسلے میں متفرق طور پر باتیں ہوتی رہیں، مطالبے بھی ہوتے رہے، مضامین بھی لکھے گئے بلکہ ایک سے زیادہ بار اوپر سے صاف لفظوں میں وعدہ بھی ہوا کہ خواتین یونیورسٹی جلد قائم کی جا رہی ہے، مگر سب کچھ ہو ہوا کر خاموشی چھا گئی۔

یہ واقعہ دو سال سے پہلے کا ہے کہ ایک دن اچانک مجھے صدر تنظیم اساتذہ پاکستان جناب حافظ وحید اللہ کا ٹیلی فون سکھر سے موصول ہوا کہ اے۔ کے۔ بروہی صاحب خواتین یونیورسٹی کا منصوبہ مانگ رہے ہیں۔ اور یہ کہہ رہے ہیں کہ چونکہ اس کام کو جلد کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے، اس لیے دو تین روز کے اندر منصوبہ کار کی دستاویز (DOCUMENT) مجھے مل جانی چاہیے — میں اپنے دفتر سے اٹھا اور سیدھا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں پہنچا اور ٹیلی فون کی اطلاع دی۔ انہوں نے بعد میں میاں طفیل محمد صاحب کو بھی بلوا لیا (شاید کوئی اور صاحب بھی تھے) اور باقاعدہ میٹنگ میں ہدایات دیں کہ پورا منصوبہ کار تیار کر دیا جائے اور چونکہ کہا جاتا ہے کہ موزوں خواتین اساتذہ نہیں ملیں گی، لہٰذا وی۔ سی اور رجسٹرار سے لے کر تمام شعبہ ہائے علوم (FACULTIES) تک پورے ٹیچنگ اسٹاف کی فہرست مرتب کر دی جائے۔ بلکہ مولانا مغفور[۱] نے باصرار یہ فرمایا تھا کہ خواتین کی جداگانہ یونیورسٹیوں کا پورا عملہ وی۔ سی سے لے کر چپڑاسی تک خواتین ہی سے لیا جانا چاہیے اور کوئی مرد اس نظام میں دخیل نہ ہو۔ مولانا کی ہدایات کے تحت جلد جلد کچھ کام میاں صاحب کے ذریعے ہوا، کچھ دلچسپی پروفیسر خورشید احمد صاحب نے لی، مولانا کے حکم (بذریعہ ٹیلی فون) کے تحت کراچی کے بعض احباب نے مجلس تنظیم اساتذہ اور ادارہ معارف اسلامی کراچی کی مدد سے خواتین پروفیسرز اور لیکچررز کی فہرستیں تیار کیں۔ یہاں تک کہ ایک ہفتے میں خواتین یونیورسٹی کا یہ بھاری بھر کم منصوبہ تیار ہو کر اے۔ کے بروہی صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ ان کا فرمانا یہ تھا کہ میں اسے خود پڑھوں گا اور صدر صاحب کی خدمت میں نفاذ کے لیے

---

[۱] واضح رہے کہ پردے کے بارے میں ہمارے حلقے کے نقطۂ نظر سے ہمارے یہ بزرگ فاضل قانون دان ذرا مختلف رائے رکھتے ہیں (جس کا انہیں حق حاصل ہے)۔

براہِ راست پیش کر دوں گا تاکہ کوئی درمیانی قوت اثر انداز نہ ہو۔ اب گویا انتظار شروع ہو گیا کہ خواتین یونیورسٹی کا اعلان وہی چار دن میں ہونے والا ہے۔

اس منصوبے کی ایک آدھ نقل محفوظ ہے (گو میرے پاس نہیں) اور فیکلٹیز کے متعلق لسٹ موجود ہے، نیز مقاصد اور قواعد و ضوابط کا خاکہ بھی ہے۔

مجوزہ یونیورسٹی کا نام "خدیجۃ الکبریٰ یونیورسٹی فار ویمن" تجویز کیا گیا تھا یا جامعۂ خدیجۃ الکبریٰ برائے خواتین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے —— اور نام کو منصوبے میں بڑی اہمیت حاصل تھی —— منصوبے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ خواتین محض نصابی معلومات ہی نہ جمع کریں بلکہ اسلامی ذہن و کردار سے آراستہ ہوں تاکہ وہ مجوزہ یونیورسٹی سے تعلیم پا کر نکلیں تو ایک طرف تو وہ گھروں میں اسلامی معاشرت کو نشوونما دے سکیں، دوسرے اگر انہیں اسلامی نظام کے تحت کوئی اجتماعی خدمت انجام دینی ہو تو وہ پردے کے اہتمام کے ساتھ حسن و خوبی سے انجام دے سکیں۔

شعبہ ہائے علوم میں سے ایک تو وہ شعبے رکھے گئے تھے، جن سے استفادہ علی الخصوص خواتین کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً گھر کا انتظام[1] اور تربیتِ اطفال۔

---

[1] مروجہ نام نچلی کلاسوں میں خانہ داری اور بالائی سطح پر ہوم اکنامکس ہے۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے خانہ داری یا گھر کے معاملات میں سب سے اہم شعبہ افرادِ خانہ سے ربط و تعلق کا شعبہ ہے۔ یہ بات کہ ایک خاتون یا طالبہ گھر کی فضا کو اسلامی رنگ میں رنگنے اور اسے غیر اسلامی اثرات سے نکالنے کے لیے بزرگوں اور ہم عمروں اور خوردوں کے ساتھ کس طرح ربط و ضبط رکھے اور ان تک اصلاح و تعمیر کا پیغام کیسے پہنچائے؟ یا وہ اخلاقی قدروں اور معاشی مفاد کی کشمکش یا اسلامی اصول و مقاصد کے خلاف مغربی تہذیب اور رسوم و رواج کے تصادم کی صورت میں اپنا پارٹ کیا اور کس طرح ادا کرے، گھر میں درس قرآن و حدیث یا مطالعۂ سیرت و تاریخ کی راہیں کیسے نکالے، گھر میں اجتماعات کس طرح منعقد کرے، تقاریب کی صحیح روح کو کارفرما رکھنے کے لیے کیا صورت اختیار کرے، رشتہ دار اور محلے دار خواتین میں (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

ایک وہ شعبے ہیں جو توسیعِ تعلیم اور فروغِ دعوت کے لیے ضروری ہیں ـــــ مثلاً علم التعلیم[۱]، نفسیات

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اثرات کس طرح پھیلاتے ۔ یہ مباحث موجودہ نصابی کتابوں میں نہیں ملیں گے ۔

[۲] تربیت اطفال کے موضوع پر بھی جو نصابی اور غیر نصابی لٹریچر ملتا ہے، وہ اس سے تو بحث کرتا ہے کہ حفظانِ صحت کے کن اصولوں کا خیال رکھنا چاہیے اور عمر کے کس مرحلے میں کیا غذا کس مقدار میں دینی چاہیے اور بچوں کی غذاؤں کی تیاری کیسے کی جائے، نیز اُن کے لباس، ان کے سونے جاگنے، ان کی صفائی وستھرائی، اُن کے کھیل تفریح کے بارے میں کیا اہتمام کرنا چاہیے، لیکن اُن کو نُورِ ایمان سے کیسے آراستہ کیا جائے، اور اُن میں اسلامی اخلاق کی بنیادیں کس طرح رکھی جائیں۔ اس بارے میں دَورِ جدید کی ساری دانش گُنگ ہے۔ لے دے کے تربیت اطفال کے لیے دَورِ جدید کی نفسیات کے کچھ اطلاقی اشارات فراہم کیے جاتے ہیں (جو بالعموم غیر اسلامی فلسفۂ نفسیات کا عکس ہونے کی وجہ سے اُلٹے نتائج دیتے ہیں) یا پھر شائستگی کے آداب وشعائر بہ شکلِ مروجہ (نہ کہ بہ شکلِ اسلامی) بتائے جاتے ہیں کہ کس طرح یہ چیزیں بچوں کو عمر کے مختلف مراحل میں سکھائی جانی چاہئیں۔ اسلام کا نظامِ تربیتِ اطفال جو کان میں کہی جانے والی اذان سے شروع ہو کر بچے کو مسجد کی صفِ نماز میں لاکھڑا کرتا ہے۔ اس کا شعور جدید مغربی لٹریچر اور اس کے نقالوں کے ہاں کہاں ملے گا۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[۱] علم التعلیم کی ساخت بھی بدقسمتی سے ہمارے مقاصد اور ہماری ضروریات کے مطابق نہیں ہے۔ ہمیں ایک ایسے علم التعلیم کی ضرورت ہے جس کا مقصود ومنشا ہی مسلم ذہن وکردار کے عالم اور معلم اور ڈاکٹر اور سائنس دان اور ماہرینِ سیاست ومعیشت پیدا کرنا ہو۔ اگر علم التعلیم اور تعلیمی تکنیک اور اس کو استعمال کرنے والا معلم اپنے زیرِ تعلیم نوجوانوں کے طرزِ فکر اور پیمانہ ہائے خیر وشر اور معیاراتِ خوب وناخوب کو اسلامی نہیں بنا سکتا ہے تو یہ سارا کھیل ایک نئی شان کی جاہلیت کا کھیل ہے۔ ایسا ہی علم التعلیم اگر ہم نے خواتین کو ان کی یونیورسٹی میں بھی پہنچا دیا تو کونسا کمال ہوا ۔

شہریت اور عمرانیات، علم الاخلاق وغیرہ۔[1]

ایک وہ شعبے جو دینی لحاظ سے اشد اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً عام اسلامیات کے علاوہ علمِ تفسیر علمِ حدیث، علمِ فقہ، علمِ تاریخ وغیرہ۔ اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ طالبات ہی سے مصنف اور صحافی و ادیب بھی اٹھیں اور درس دینے والی اور تبلیغ کرنے والی خواتین بھی۔

بعد ازاں وہ شعبے جن سے خاص خاص طالبات کو اپنی امتیازی ذہنی ساخت یا ذوق و شوق کی وجہ سے خاص قابلیت حاصل کرنی ہو، مثلاً مابعد الطبیعاتی فلسفہ، وغیرہ۔

ایک وہ شعبے جن سے فائدہ اُٹھا کر ایک پردہ دارانہ معاشرے میں خواتین ایسی ذمہ داریاں انجام دے سکتی ہیں، جن کے لیے نسائی حلقوں میں مردوں کی خدمات پسندیدہ نہیں ہیں، مثلاً میڈیکل ڈاکٹر، فزیشن، سرجن، آئی سپیشلسٹ یا ڈنٹل سرجن وغیرہ۔

بہ حیثیت مجموعی علوم پر کوئی سخت قدغن بھی نہیں تھی۔ فرق صرف زور دینے کا تھا کہ اہمیت کن چیزوں کو حاصل ہوگی اور زیادہ کام کن دائروں میں کرنا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ نے اس امر پر زور دیا تھا کہ خواتین یونیورسٹی کی اساتذہ و طالبات تعلیم گاہ میں آنے جانے پردے کا اہتمام رکھیں گی۔

دوسری بات جس پر انھوں نے زور دیا تھا یہ تھی کہ جہاں کہیں ایسی یونیورسٹی کھل جائے، وہاں ایک مختصر مقررہ مدت کے مجبورانہ استثنا کے بعد کسی طالبہ کا داخلہ لڑکوں کے کالجوں یا مخلوط تعلیمی اداروں

---

[1] ان سب علوم پر مغرب کا تیار کردہ لٹریچر اور نصابی کتب کا انبار جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اس میں ہر علم کی بنیادیں ملحدانہ مادہ پرستی پر رکھی گئی ہیں۔ بنیاد کی اس ٹیڑھ کی وجہ سے ان علوم کی ساری تعمیر غلط ہوتی ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ جب تک ہم خدا پرستانہ بنیادوں پر نئی نصابی کتب تیار نہ کرلیں، باہر کے جو علوم بھی طلبہ کے سامنے لائیں اُن پر مسلم نقطۂ نگاہ سے بھرپور تنقید ہونی چاہیے اور اُن کے ہر غلط دعوے کی شدید طریق سے تردید کی جانی چاہیے۔ اور یہ تنقید نصابی کتابوں میں شامل ہونی چاہیے۔

یں ممنوع ہو جائے۔

تیسری بات جس پر مولانا نے زور دیا تھا یہ تھی کہ خواتین کے لیے جداگانہ یونیورسٹی کو پہلے قدم کی حیثیت دی جائے اور اُس کے آغاز کے ساتھ ہی مخلوط مجالس اور مخلوط ثقافتی سرگرمیوں کا سلسلہ یک قلم ترک کر دیا جائے۔

یعنی ایک طرف پردے کا فروغ اور دوسری طرف مخلوط تعلیم کے ساتھ مخلوط معاشرت کے خاتمے کی طرف مؤثر اقدامات اُس منصوبے کی رُوح رواں تھے۔[1]

اور اُس منصوبے میں یونیورسٹی کو حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ سے اس لیے موسوم کیا گیا تھا کہ طالبات اور لیڈی لیکچررز اور دوسری خواتین بھی حضرتِ موصوفہ کو اپنے لیے معیار بنائیں۔ ویسے خیالات اور ویسے اخلاق اور ویسے کردار سے اپنے آپ کو آراستہ کریں۔

یہ تھے اُس منصوبے کے خد و خال جو تقریباً ۲/۱ سال قبل پیش کیا گیا تھا۔

اب دیکھیے کہ اس کا حشر کیا ہوا!

بہت ہی بالائی سطح پر جن دماغوں نے اس پر غور و خوض کیا، ان میں بعض یقیناً ایسے ہوں گے جو سیکولرازم کے مسحور رہوں کتنی مشکل سے یہ منصوبہ اُن کے اندر اُتر سکتا تھا۔ پھر وہاں سے یہ بیوروکریسی کے ہاتھوں میں پہنچا ہوگا۔ اس نے اُسے تاخیر کے خراد پر چڑھا دیا ہوگا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ چھل چھلا کر مناسب شکل اختیار کرے گا۔[2]

---

[1] کیونکہ اسلام نسائیت کے وقار کا پورا پورا تحفظ چاہتا ہے اور وہ اُسے نہ گندی نگاہوں کے لیے ہوس کا کھلونا بنانے کی اجازت دیتا ہے، نہ اس کے حسن و جمال کو میکدوں اور نائٹ کلبوں، رقص گاہوں اور طوائف خانوں کی منڈی کا بکاؤ مال بنانا گوارا کرتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اُس کے چہرے اور بدن کو اشتہاروں اور دکانوں اور ہوٹلوں میں بطور سامانِ کشش کے استعمال کرے۔

[2] میری ذاتی معلومات کے مطابق تین مختلف منصوبے اوپر پہنچے تھے جن میں سے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

چنانچہ اب وہ مناسب شکل اختیار کر کے سامنے آگیا ہے۔ عورتوں کے خاص مضامین اس میں سے خارج، دینی مضامین خارج۔ باقی جو مضامین نمایاں ہیں وہ اُونچی قسم کی تکنیکی مہارتیں ہیں جن کی ضرورت زیادہ تر صنعتی معاشروں میں ہے۔ ان مہارتوں کو حاصل کر کے ہماری خواتین فوڈ پراڈکشن، الیکٹریکل انجینئرنگ، ریڈیو ٹیلی وژن انجینئرنگ یا ایسے ہی دیگر کارخانوں میں ملازمتیں قبول کر کے مردوں کے "دوش بدوش" ترقی کی مہم سر کر سکتی ہیں، نیز وہ مغربی ممالک اور شرقِ وسطیٰ میں بھی اپنی خدمات اُونچے داموں پیش کر سکتی ہیں[1]۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خواتین یونیورسٹی کا جو منصوبہ سامنے آیا ہے وہ مخلوط معاشرے کے فتنے کو اور توسیع دینے والا ہے۔ اسلامی ذہنیت کے نشوونما یا پردے کے فروغ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس قسم کی خواتین یونیورسٹی میں تو جینز پہننے والی یا کھلے بازووں اور عریاں ٹانگوں والی طالبات بھی بصد شوق داخلہ لیں گی، کیونکہ اب یہ سوال تو ہوگا ہی نہیں کہ مرد طالب علم ساتھ ہوتے ہیں۔ جامعہ برائے خواتین کے "تازہ سرکاری منصوبے" میں تو یہی طے نہیں ہے کہ ہمیں کس قسم کی خاتون اسلامی نظامِ حیات میں درکار ہے۔ نقشہ لیا گیا ہے ٹھیک مادہ پرست مغربی معاشروں کی سی لیکن جسٹ خواتین کا، اور دوسری طرف مقصود ہے اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کا احیا اور اسلامی قانون اور اسلامی اخلاق کا فروغ: فیا للعجب!

(باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

ایک گلبرگ لاہور کے ہوم سائنس کالج کی پرنسپل صاحبہ کا منصوبہ بھی تھا۔ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ سرکاری نقشہ کار اسی منصوبے پر مبنی ہے۔ کیونکہ موصوفہ کا ذہن ہمارے سیکولر مزاج افسران کے حسبِ پسند کام کرنے والا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] یہ تو غالباً سوچا ہی نہ گیا ہوگا کہ جس قوم میں محنت کش مردوں کے علاوہ ہر سال اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہونے والے بے شمار نوجوانوں کے روزگار کا مسئلہ ٹیڑھا مسئلہ ہے، اس میں اگر خواتین کو اعلیٰ ٹیکنولوجیکل خدمات کارخانوں کی ماہرانہ مزدوری کے لیے تیار کر لیا گیا تو مردوں کی بے روزگاری کا پھیلاؤ کیا رنگ لائے گا؟

شوال المکرم

مولانا محمد خلیل اللہ ربانی

لفظ شوال کا معنی شوال (ش و ل) سے مشتق ہے۔ اس کا لغوی معنی: اٹھنا، ابھرنا، کھڑے ہونا اور بلند ہونا ہے۔ لہٰذا رمضان المبارک کے بعد ماہ شوال کے لانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو تربیت اور تزکیہ لوگوں نے ماہ رمضان المبارک میں حاصل کیا ہے، اب اُس کے مطابق زندگی گذارنے کے لیے اور اُس کو اپنا معمول بنانے کے لیے اٹھیں، ابھریں اور اقامتِ دین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں۔

اس کے علاوہ ایک توجہ دہانی یہ بھی ہے کہ لوگ حج کے لیے اٹھیں اور تیار ہو جائیں، اس لیے کہ یہاں سے اشہرِ حج کا آغاز ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ڼ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (البقرہ ۲: ۱۹۷)	حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل کوئی بدعملی اور کوئی لڑائی جھگڑا سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے بچو۔

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اشہرِ حج سب کو معلوم ہیں، اس لیے کہ زمانہ قدیم سے تا امروز حج کے لیے شوال، ذیقعدہ اور ذوالحج کے بیس دن معروف و مقرر چلے آرہے ہیں۔ کتبِ احادیث و تفاسیر میں حضرت ابو امامہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی اشہر حج کی یہی تفسیر منقول ہے۔

شوال سے اشہرِ حج شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں۔ بعض فقہاء کرام کے نزدیک قبلِ شوال حج کا احرام باندھنا بالکلیہ باطل اور کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں ہوگا۔ جس طرح نماز کے لیے قبل از وقت تکبیر تحریمہ کہنے کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی طرح شوال سے قبل حج کے احرام کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اور فقہاء حنفیہ کے نزدیک قبل شوال حج کا احرام باندھنا مکروہ ہے اور حج کے دیگر اعمال باطل ہیں۔

ماہ شوال کی دو حیثیتیں | پہلی حیثیت یہ ہے کہ وہ ماہ رمضان المبارک کا تتمہ ہے اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ اشہرِ حج کا آغاز ہے۔ اس کی پہلی حیثیت کے تین وجوہ ہیں:

اوّل: شوال کی پہلی تاریخ کو رمضان المبارک کی تکمیل پر بطور شکرانہ عید الفطر ادا کی جاتی ہے۔

دوم: حقوقِ رمضان میں بندوں کی طرف سے جو کوتاہیاں واقع ہو جاتی ہیں ان کی تلافی اور تدارک کے لیے شوال کی صبح صادق کو صدقۃ الفطر واجب ہو جاتا ہے۔

سوم: شوال کے چھ نفلی روزے ماہ رمضان سے مل کر اجر و ثواب میں صیام الدہر (کم از کم ایک سال) کے برابر ہو جاتے ہیں۔ کما ورد فی الحدیث[1]۔ ان تین وجوہ سے معلوم ہوا کہ یہ مہینہ ماہ رمضان المبارک کے لیے بطور تتمہ ہے۔

ماہ شوال کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ اشہرِ حج کا آغاز ہے۔ اس حیثیت کی بنا پر فقہاء کرام نے چند مسائل متفرع کیے ہیں، مثلاً:

۱۔ ماہ شوال سے قبل حج کا احرام باندھنا فقہاء حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے اور حج کا

---

[1] مسلم عن ابی ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ مشکوٰۃ ص ۱۷۹

کوئی دوسرا عمل کیا تو وہ باطل ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ماہ رمضان میں حج کا احرام باندھا اور مکہ معظمہ پہنچ کر طوافِ قدوم (ابتدائی طواف) کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی (طواف) بھی کر لی تو یہ سعی حج کے لیے معتبر نہ ہوگی، اشہر حج میں اس کو دوبارہ سعی کرنی پڑے گی۔

۲۔ افراد، تمتع اور قران حج کی تین قسمیں ہیں۔ آخری دونوں قسموں کے حجاج پر بہرصورت قربانی واجب ہوتی ہے، خواہ وہ مساکین ہی ہوں، لہٰذا تمتع اور قران کرنے والے حجاج اگر قربانی کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو اس کے عوض ان کو دس روزے رکھنے چاہئیں ـــــ اس طرح کہ تین روزے بحالتِ احرام اشہرِ حج کے اندر (یکم شوال سے نویں ذوالحجہ تک) رکھیں اور باقی سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہیں اور جب چاہیں رکھ لیں۔ لیکن اگر کسی شخص نے پہلے تین روزے شوال سے قبل ہی رکھ لیے تو پھر یہ دس روزے قربانی کا بدل نہیں بن سکتے۔ اب اس کو قربانی ہی کرنی پڑے گی۔ جب بھی استطاعت حاصل ہو جائے حرم میں قربانی کر دے۔

نیکی اور بدی کی جزا کا قانون

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں جو یہ ارشاد ہے کہ ماہ شوال کے چھ روزے ماہ رمضان المبارک سے مل کر اجر و ثواب میں صوم الدھر (کم از کم ایک سال) کے روزوں کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے (۷: ۱۵۶)۔ اُس نے نیکی اور بدی کا بدلہ دینے کا قانون یہ بنایا ہے کہ:-

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

(الانعام ۶: ۱۶۰)

جو شخص اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اُس کے لیے دس گنا اجر ہے۔ اور جو بدی لے کر آئے گا اُس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اُس نے قصور کیا ہے اور اُن میں سے کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ تو نیکی اور بدی کی جزا کا عام قانون ہے اور مالی صدقات کا اجر اس سے بھی زیادہ دیا جاتا ہے، اس لیے کہ حسناتِ قولیہ اور فعلیہ کی نسبت مال کا خرچ کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ مال کی محبت شدید ہوتی ہے (اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ) اس لیے اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ کا اجر کم از کم سات سو گنا تک بیان فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ	جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے
اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	ہیں۔ اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک
كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ	دانہ بویا۔ اور اس سے سات بالیں نکلیں اور
سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ	ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ
حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ	جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔

(البقرہ ۲ : ۲۶۱)

اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے یعنی اس کو سات سو گنا سے بھی زیادہ اجر دیتا ہے۔ یہ اہلِ انفاق کے تقویٰ، اخلاص اور حالات کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ،

"جس شخص نے اپنے حلال اور طیب کسب سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا تو اللہ تعالیٰ اُس کے اجر کو بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم گھوڑے کے بچے کو پالتے اور بڑھاتے ہو۔ یہاں تک کہ وہ اجر پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے"[۱]

کسی پہاڑ کے اجزاء کھجور کے برابر نکالے جائیں تو وہ سات سو سے کئی گنا زیادہ اور بے شمار ہوں۔ اسی طرح بعض اشخاص کے اخلاص اور حالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ اُن کا اجر لاکھوں گنا بڑھا دیتا ہے۔ واللہ واسع علیم۔

جزاء بشرطِ بقائے عمل سورہ انعام کی مذکورہ آیت (۱۶۰) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

[۱] رواہ الشیخان عن ابی ہریرہؓ۔ مشکوٰۃ۔ ص ۱۶۷۔

جو شخص اللہ کے حضور نیکی یا بدی لے کر آئے گا اُس کو یہ جزا دی جائے گی۔ یوں نہیں فرمایا کہ جس نے نیکی یا بدی کا ارتکاب کیا ہو اُس کو یہ جزا دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عمل کی اُخروی جزاء تب ملے گی جب کہ وہ عمل خدا تعالیٰ کی ملاقات تک باقی اور محفوظ ہے۔ اگر اس مدت سے قبل ہی کسی کا گناہ معاف ہو گیا، یا کسی کی نیکی ضائع اور باطل ہو گئی تو پھر مذکورہ جزا بھی مرتب نہیں ہو گی۔

واضح ہو کہ کفر، شرک، ارتداد اور ایذاءِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چار گناہ ایسے ہیں کہ اُن سے تمام نیکیاں حبط (ضائع) ہو جاتی ہیں۔ احسان جتانے سے احسان کا اجر ضائع ہو جاتا ہے اور مسجد میں دُنیاوی باتیں کرنے سے عباداتِ نافلہ کا اجر ضائع ہو جاتا ہے وغیر ذالک اسی طرح بہت سی نیکیاں گناہوں کو دھوڈالتی ہیں۔ (اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ۱۱:۱۱۴)

وحی کے تعلیمی سال کا آغاز قرآن مجید کا نزول رمضان المبارک میں شروع ہوا۔ مسند امام احمدؒ کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتبِ سابقہ کا نزول بھی رمضان المبارک میں ہوا تھا۔ لہٰذا رمضان المبارک وحی الٰہی کے اخذ و قبول کا مہینہ تھا۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ رمضان کے بعد متصل ہی اس وحی الٰہی کے ضبط، حفظ، تعلیم و تدریس اور تبلیغ و اشاعت کا کام شروع ہو جائے لہٰذا ماہ شوال وحی الٰہی کے تعلیمی سال کا آغاز بھی ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ عالمِ اسلام کے اکثر دینی مدارس کا تعلیمی سال ماہ شوال سے شروع ہوتا ہے اور پندرہ شعبان پر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر رمضان المبارک میں قرآن مجید کا اخذ و سماع ہوتا ہے۔

لہٰذا ماہ شوال کی آمد یہ دعوت دیتی ہے کہ ہم کتاب اللہ کے حقوق اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اٹھیں اور اس تربیت کو ضائع نہ ہونے دیں جو ماہ رمضان المبارک میں حاصل ہوئی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ترکی میں اسلام اور سیکولرازم کی کشمکش

(حالیہ انقلاب سے پہلے تک)

جناب خلیل احمد حامدی صاحب

(۲)

اسلامی تحریک نئے دور میں

میں اسی دور کو ترکی کی اسلامی تحریک کا اصل دور ولادت کہتا ہوں۔ پہلے اسلامی تحریک فکر و نظر اور چند ظاہری اعمال تک محدود تھی۔ اب وہ فکر اور تنظیم دونوں لحاظ سے جامع صورت اختیار کرنے لگ گئی۔ پریس کے جدید قوانین سے جس طرح لیساری عنصر نے فائدہ اٹھایا اسی طرح اسلامی عناصر نے بھی ان سے زیادہ پختگی اور گہرائی کے ساتھ فائدہ اٹھایا۔ آزادی نشر و اشاعت کی تلوار فراہم تو اسلام کی بیخ کنی کے لیے کی گئی تھی۔ مگر اسلامی عناصر نے بڑی حکمت و دانشمندی کے ساتھ اسے خود اسلام کے حق میں استعمال کر لیا۔ اسی دور میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ، حسن البنا شہید، سید قطب شہید اور دیگر تحریکی مصنفین کا لٹریچر ترکی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوا۔ بلکہ اس قدر تیزی سے پھیلا کہ جنگل کی آگ ثابت ہوا۔ سعید نورسی کے اثرات، عدنان مندریس کی اسلامی خدمات اور اب تحریک اسلامی کے ٹھوس لٹریچر نے مل کر ترکی کے اندر نئی اسلامی نسل کی داغ بیل ڈال دی۔ ترکی طلباء کے اندر اس لٹریچر کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بائیں بازو کے نظریات کا توڑ کرنے کے لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب کی کتابوں نے نوجوان طلباء کو کارگر اسلحہ فراہم کر دیا۔ یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں ہر جگہ ایک سخت کشمکش چھڑ گئی۔ اس کشمکش میں اسلام پسند طلباء کا پلڑا بھاری ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ترکی کی سٹوڈنٹ یونین (ایم۔ ٹی۔ ٹی۔ ی) جو ملحد اور اشتراکی طلباء

کے قبضے میں تھی۔ آخر کار اس پر بھی اسلام پسند طلبا نے غلبہ حاصل کر لیا۔ ۱۹۶۴ء کے بعد اسلامی تحریک میں خاصی نشوونما ہونے لگی۔ اسلامی تعلیم کے علمی ادارے مزید قائم ہوتے گئے۔ اسی زمانے میں الٰہیات کالج کا قیام عمل میں آیا۔ مدارسِ ائمہ وخطبا کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ یہ سب عوام الناس کے سیاسی دباؤ، اخلاقی تعاون اور مالی مدد کے ساتھ ہوا۔ ان تعلیمی اداروں میں سے تقریباً ۵ لاکھ نوجوان ایسے نکلے جو جدید اسلامی رُوح اور تحریکی نظریات سے خوب بہرہ مند تھے اور جو آئندہ اُٹھنے والی اسلامی لہر کے لیے ہراول دستہ بن گئے۔

سیاسی زندگی کی بحالی اور عدالت پارٹی کا ظہور فوج نے ملک کے اندر سیاسی سرگرمیوں کی اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ڈیموکریٹک پارٹی کو بحال نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بجائے ایک اور پارٹی وجود میں آگئی۔ یہ تھی عدالت پارٹی ___ ڈیموکریٹک پارٹی کے لوگوں کی اکثریت اس نئی پارٹی سے وابستہ ہوگئی ___ عدالت پارٹی فروری ۱۹۶۱ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے بانی راغب گوموش تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس کی قیادت سلیمان ڈیمریل کے ہاتھ آگئی۔ کمال پاشا کی ری پبلکن پارٹی کے مقابلے میں اس نئی پارٹی کو ترقی اور کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کی طرح عوام کے اسلامی جذبات کو اپیل کرے۔ مگر ایک نئے اسلوب کے ساتھ تاکہ اس انجام سے دوچار نہ ہو جائے جو ڈیموکریٹک پارٹی کا ہوا۔ چنانچہ سلیمان ڈیمریل اور اُس کے ساتھی ایک حد سے آگے اسلام کا نام نہیں لینا چاہتے تھے، لیکن رائے عامہ کے دباؤ نے اُسے اسلامی خطوط کی طرف مائل ہونے پر مجبور کر دیا۔ سلیمان ڈیمریل لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مسجدوں میں جا کر نمازیں پڑھنے لگے، اس کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۶۵ء کے عام انتخابات میں عدالت پارٹی کو ۴۵۰ نشستوں میں سے ۲۴۳ نشستیں حاصل ہوگئیں۔ ڈیمریل نے کامیاب ہونے کے بعد مدارسِ ائمہ وخطبا کی تعداد ۷۲ تک بڑھا دی۔ اور حفظِ قرآن کی مکاتب کی تعداد میں بھی غیر معمولی حد تک اضافہ کر دیا۔

- - - - - - - - - - - -

عرب ممالک کی طرف بھی اس کا میلان شروع ہوا۔ گو وہ برابر یہ بیان دیتا رہا کہ اسلام اور کمال ازم میں تضاد نہیں ہے۔ سلیمان ڈیمریل کا سب سے اہم فیصلہ وہ تھا جس کی رُو سے اُس نے ۱۹۶۹ء میں رباط میں مسلم سربراہوں کی کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ پہلی جنگ عظیمہ کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ترک نمائندے عربوں کے ساتھ ایک کانفرنس میں بھائی بھائی بن کر بیٹھے۔ ترکی کے نامور لادین اخبار جمہوریت کے نمائندے نے

سلیمان ڈیمریل سے یہ سوال کیا کہ ترکی ایک سیکولر اسٹیٹ ہے وہ رباط کی اسلامی سربراہی کانفرنس میں کیوں شریک ہو رہا ہے۔ کیا یہ کمال ازم سے بغاوت ہے؟ سلیمان ڈیمریل نے جواب میں کہا کہ "بیت المقدس کی اہمیت ترکوں کے لیے دوسری کسی بھی قوم سے زیادہ ہے۔" فرانس کے اخبار نے اسلامی کانفرنس میں ترکی کی شمولیت پر ایک مضمون شائع کیا، جس کا عنوان تھا "مردہ انسان بیدار ہو گیا ہے۔" چنانچہ اس کے بعد ترکی کے اندر دینی بیداری کے خلاف عالمی پیمانے پر پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ اس پروپیگنڈے کی قیادت استنبول کے روزنامے **ملّت** کا یہودی ایڈیٹر سامی کوہین کر رہا تھا۔

پھر فوجی انقلاب

فوج حسبِ عادت پھر حرکت میں آگئی۔ فوج نے ترکی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا محاصرہ کر لیا۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں سلیمان ڈیمریل کی حکومت برخاست کر دی گئی۔ فوجی جرنیلوں نے ترکی ریڈیو سے یہ وارننگ نشر کی:۔

> "پارلیمنٹ اور حکومت دونوں نے جمہوریہ ترکیہ کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ان دونوں اداروں نے ملک کو انتشار، خانہ جنگی اور معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ترکی قوم کی یہ اُمیدیں ختم کی جا رہی ہیں کہ ترکی جدید تہذیب کے معیار پر پورا اُترے یعنی اُس مقصد کو پورا کرے جو کمال اتاترک نے وضع کیا تھا۔"

ادھر ۱۹۶۹ء میں مسلم طلبا کی یونین اور دیگر متفرق اسلامی تنظیموں کے اندر مزید ہم آہنگی پیدا ہو گئی اور انھوں نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جو ہمہ گیر پیمانے پر اسلامی جدوجہد کی ذمہ داری اپنانے اور اسلام کی کھلم کھلا دعوت دینے اور روایتی پارٹیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

ملّی نظام پارٹی کا قیام

۱۹۶۵ء کے انتخابات میں نجم الدین اربکان نے بھی حصّہ لیا اور وہ اور ان کے چند ساتھی پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔ نجم الدین اربکان استنبول یونیورسٹی میں انجینئرنگ کالج میں ریاضیات کے پروفیسر تھے۔ وہ دینی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کی اپنی تربیت بھی روحانیت پسند ماحول میں ہوئی ہے۔ پارلیمنٹ میں پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنے تین ساتھیوں سمیت ترکی کے اندر پہلی باقاعدہ اسلامی پارٹی کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کا نام ملّی نظام پارٹی رکھا گیا۔ ایک عوامی جلسے کے اندر پہلی مرتبہ نجم الدین اربکان نے اپنی تقریر کا آغاز اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ سے کیا۔ کسی پارٹی کے سربراہ کی طرف سے پہلی مرتبہ یہ الفاظ استعمال کیے گئے۔ کیونکہ ان الفاظ کا استعمال قانوناً

ممنوع تھا۔ یہ نومولود اسلامی پارٹی گو مادی وسائل کے لحاظ سے نہایت فقیر تھی۔ لیکن ترک عوام کے اندر اُسے مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ صیہونی، فری میسن اور مغربی ذرائع ابلاغ نے اس کے خلاف نہایت بھونڈا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ یہ پارٹی جب کسی علاقے میں اپنی کوئی شاخ قائم کرتی تو علاقے کا حاکم اس کی مخالفت کرتا۔ اس پر الزام صرف یہ تھا کہ یہ سیکولرازم کے خلاف ہے، اور ملک میں دوبارہ اسلامی شریعت کا نفاذ چاہتی ہے۔

ملی نظام پر پابندی اور مقدمات ملی نظام پارٹی نے ۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو انقرہ میں اپنی پہلی کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں نوجوانوں نے اسلامی شریعت اور اسلامی نظام کے احیاء کے حق میں نعرے لگائے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں بھی قرآن کریم کو اپنا دستور ثابت کیا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اُسی رات حکومت کی طرف سے ایک آرڈی ننس جاری ہوا جس کے ذریعے یہ پارٹی توڑ دی گئی، اور اس کے ارکان گرفتار کر لیے گئے، اور مملکت کے خلاف بغاوت کے الزام میں پبلک سیکورٹی کورٹ میں اُن کے خلاف مقدمات دائر کر دیے گئے۔ پھر اسی مہینے میں جیسا کہ اُوپر گذر چکا ہے فوج نے دخل دے کر سلیمان ڈیمریل کی حکومت توڑ ڈالی۔ فوج کے بیان کے موجب سلیمان ڈیمریل کی حکومت کے دوران ملک کے اندر بدامنی بڑھ گئی اور ملک کمال ازم سے دُور ہٹنے لگ گیا۔

توازن قائم رکھنے کے لیے فوجی حکومت نے کمیونسٹوں کی پارٹی حزب العمال بھی توڑ دی۔ مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اور ملک آہنی پنجرے کے اندر مقید ہو گیا۔ اسلامی تحریک یعنی ملی نظام نے پارٹی کے ارکان پر مقدمات چلانے کے لیے فوجی عدالتیں تشکیل دی گئیں۔ دکھانے کے لیے حزب العمال کے افراد پر بھی مقدمات قائم کیے گئے مگر قدرتِ خداوندی نے اس موقع پر بھی اسلامی تحریک کے لیے اس تاریکی کے اندر سے روشنی کا پہلو اجاگر کر دیا۔

حزب العمال کے لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو تحقیقات کے بعد فوج کو یہ معلوم ہوا کہ کمیونسٹوں کے پاس خفیہ اسلحہ کے وافر ذخائر موجود ہیں، بلکہ ایسی فہرستیں ان کے دفاتر سے دستیاب ہوئیں جن میں کئی فوجی جرنیلوں کے نام تھے جنہیں وہ موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے یا اُن کے بیوی بچوں کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔ نیز یہ بھی منکشف ہوا کہ کمیونسٹ بیرونی مدد کے بل بوتے پر ترکی کے اندر ایک خفیہ "آزاد فوج" قائم کر رہے ہیں۔ یوں بائیں بازو کے عناصر خود ہی پھندے میں آ گئے۔ اُن کو یہ توقع نہ تھی

کہ وہ فوج جس نے اُن کے لیے خود راستے ہموار کیے ہیں اور اسلامی شعور کے مقابلے میں مارکس ازم کی اشاعت کا انہیں موقع دیا، انہیں بھی کوئی ضرب لگائے گی۔ لیکن اب کمیونسٹ فوج کی گرفت میں آگئے اور فوج کو اسلام پسندوں کے بجائے سب سے زیادہ خدشات خود کمیونسٹوں سے لاحق ہوگئے۔

دوسری طرف ملی نظام پارٹی کے قبضے سے کچھ بھی دستیاب نہ ہوا۔ اگر اُن کے گھروں سے کچھ ملا تو وہ صرف اسلامی لٹریچر تھا۔ مزید برآں اُس میں سے خیر کا یہ پہلو بھی برآمد ہوا کہ مقدمات کے ضمن میں ملی نظام کے ارکان کو عوام الناس سے ملنے اور وکلا اور ججوں اور پولیس کے افسروں سے رابطہ و ربط قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ ان لوگوں نے ملی نظام کے لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ ان کے ذاتی حالات اور کردار سے آگاہ ہوتے اور اُن پر یہ بات خوب کھل گئی کہ کس حد تک یہ لوگ محب وطن اور ترک عوام کے خیر خواہ ہیں۔ عوام الناس بھی مقدمات کی کارروائیوں کو بڑے شوق سے سن رہے تھے۔ یہ مقدمات بڑے مبارک ثابت ہوتے ان کے ذریعے سے اسلام کی آواز خود فوج کے افسروں تک پہنچی۔ یہاں تک کہ بعض فوجی افسران یہ کہتے سنے گئے کہ "کاش اُن کی اولاد بھی ایسے ہی کردار کی مالک ہوتی جو ملی نظام پارٹی کے کارکنوں کے اندر پایا جاتا ہے"۔ جج بھی ان کارکنوں سے متاثر ہوتے۔

ملی نظام کے بعد ملی سلامت پارٹی

یہ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ معاہدہ اطلانتک میں ترکی کا رکن ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ ترکی میں سیاسی پارٹیوں کا نظام قائم رہے، مگر ان پارٹیوں کے اندر کوئی ایسی پارٹی نہ ہونی چاہیے جو ترک کو مغرب اور لادینیت کے گود سے نکال کر کسی اور راستے پر ڈال دے۔ ترکی فوج خود اس حکمتِ عملی کی حفاظت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار سیاسی زندگی میں دخل دیتی رہتی ہے۔ چنانچہ دیمریل کی حکومت کے خاتمے کے بعد فوج پھر سیاسی زندگی بحال کرنے پر مجبور ہوگئی اور گو اب فوجی حلقوں میں ملی نظام پارٹی کے حق میں کسی حد تک ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے لیکن فوج اپنا اصول ترک کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی اور اُس نے اس شرط پر سیاسی پارٹیوں کی بحالی کی اجازت دی کہ ملی نظام پارٹی کو دوبارہ زندہ نہ کیا جائے۔

ملی نظام پارٹی کے لوگوں نے بھی دانشمندی کا ثبوت دیا اور انہوں نے اس قانون کا احترام کیا اور ملی نظام کی بجائے ایک نئی پارٹی قائم کر دی۔ یعنی ملی سلامت پارٹی۔ اس پارٹی کی قیادت، کارکن اور اغراض و مقاصد وہی قرار دیئے، جو ملی نظام پارٹی کے تھے۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ملی سلامت پارٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔

پارٹی کے قیام کے ایک سال بعد ۱۹۷۳ء میں ترکی میں عام انتخابات منعقد ہوئے - ملی سلامت پارٹی نے ۴۹ نشستیں جیت لیں اور ترکی کی تیسری بڑی پارٹی بن گئی - بلکہ توازنِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آگیا - ری پبلکن پیپلز پارٹی اور عدالت پارٹی دونوں میں سے کوئی اس پوزیشن میں نہ تھی کہ ملی سلامت کے اشتراک کے بغیر تنہا حکومت تشکیل دے سکتی - ملی سلامت پارٹی نے حالات کا اندازہ لگا کر ری پبلکن پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر کولیشن گورنمنٹ کی تجویز منظور کر لی - ملی سلامت پارٹی کی طرف سے اس کولیشن کے لیے جو شرائط پیش کی گئیں ان میں سے چند ایک یہ تھیں :-

۱- اسکولوں کے اندر اخلاقی تعلیم دی جائے گی - اخلاقی تعلیم سے مراد ہے اسلامی تعلیم - لیکن ری پبلکن پیپلز پارٹی کے حلقے سے "اسلام" کا لفظ اتنا مشکل ہو گیا - اور اس پر کئی بار مشترکہ حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات بحران کا شکار ہوئے - آخر کار منشور کے اندر "اسلام" کے بجائے "اخلاق" کا لفظ لکھ دیا گیا -

۲- عالم اسلام اور علی الخصوص عرب ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کیے جائیں گے -

۳- اسلامی کانفرنسوں میں ترکی کا نمائندہ مبصر کی حیثیت سے نہیں بلکہ رکن کی حیثیت سے شریک ہوگا اور اپنا ووٹ استعمال کرے گا -

ملی سلامت پارٹی نے مسئلہ فلسطین کی حمایت بھی کی - اور اسرائیل کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کا مطالبہ کیا -

اسی دور میں عصمت انونو دنیا سے رخصت ہوئے - بستر مرگ پر موصوف نے یہ لفظ کہے تھے :-

"میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اسے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا - ترکوں کے دلوں سے اسلام کو نکالنے اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کاشت کرنے میں ہم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا - لیکن اس کے نتائج ہماری توقع کے بالکل برعکس نکلے - بیج ہم نے لادینیت کا بویا تھا مگر اس کا پھل اسلام کی شکل میں ظاہر ہوا"

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ملی سلامت پارٹی کو صرف ۲۴ نشستیں ملیں - اس کی وجہ عوامی مقبولیت کی کمی نہ تھی - بلکہ پورا مغربی پریس اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گیا - انتخابی مہم چلانے کے لیے بھی وقت بہت کم دیا گیا - انتخابی حلقوں کی ترتیب میں بھی دھاندلی کی گئی - نیز سعید نورسی رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکار

دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ عدالت پارٹی کے ساتھ جا ملا اور قلیل تعداد ملی سلامت کے ساتھ رہ گئی۔ اس سب کے باوجود ترک عوام کے اندر اسلامی تحریک جس کی قیادت سلامت پارٹی کر رہی تھی پیش قدمی کرتی گئی۔ ترکی میں اسلام کی پیش رفت کی موجودہ تصویر مندرجہ ذیل اعداد و شمار میں کسی حد تک دیکھی جا سکتی ہے۔

ملی سلامت کے دور کی اسلامی اصلاحات ۱۹۵۰ء میں جب پہلی مرتبہ ڈیموکریٹک پارٹی علدنان مندریس کی قیادت میں کامیاب ہوئی تو چند معمولی اسلامی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ ۱۹۵۱ء میں سات صوبوں میں ثانوی درجے کے چند مدارس ائمہ و خطبا کھولے گئے۔ استنبول میں اعلیٰ اسلامی تعلیم کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا، اور پھر انقرہ میں ایک الٰہیات کالج کھولا گیا۔ سلیمان دیمریل کے دور میں ائمہ و خطبا کے مدارس کی تعداد ۱۵۰ ہو گئی۔ لیکن ملی سلامت پارٹی کے وجود میں آنے کے بعد یہ اعداد و شمار اس حد تک بڑھ گئے کہ جنرل البورین کنعان اور اس کے چند ساتھیوں نے پھر محسوس کر لیا کہ لادینیت کا قصر منہدم ہونے کے قریب آ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حسب معمول پھر سیاسی زندگی ختم کر کے فوج کی حکمرانی قائم کر دی ہے۔ اُن کو اسلام کی پیش قدمی کے جو اثرات ورثے میں ملے ہیں وہ یہ ہیں:۔

وہ ادارے جو براہ راست محکمہ امور مذہبی کے تحت ہیں (اور یہ محکمہ وزیر اعظم یا صدر کی نگرانی میں کام کرتا ہے) یہ ہیں:۔

۱۔ حفظِ قرآن کے مدرسے۔ ۲۳۸۵

۲۔ ان مدرسوں میں تعلیم پانے والے طلباء ۳۰۸۹۸ لڑکے اور ۲۴۸۹۸ لڑکیاں۔

۳۔ ان میں معلّمین اور معلّمات کی تعداد ۱۷۰۰

۴۔ انسپکٹروں کی تعداد۔ ۴۱۴

۵۔ واعظین کی تعداد۔ ۵۶۳

۶۔ مسجدوں کی تعداد۔ ۳۳۰۰۰

۷۔ ائمہ اور موذنین کی تعداد۔ ۴۴۴۶۳

وزارتِ تعلیم کے تحت چلنے والے ادارے یہ ہیں:۔

۱۔ ائمہ و خطباء کے اسکول (ثانوی معیار کے) ۳۴۰

۲ — ان میں تعلیم پانے والے = ۱۶۱۳۷۶ لڑکے ۱۲۶۳۸ لڑکیاں۔

۳ — اعلیٰ اسلامی تعلیم کے ادارے = ۸

۴ — ان اداروں میں تعلیم پانے والے = ۶۲۴۰

۵ — انقرہ کا الٰہیات کالج اور ارضروم کا کلیۃ العلوم الاسلامیہ۔

۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ترکی کی ملی سلامت پارٹی نے قونیہ میں بہت بڑا اجتماع کیا جسے ترکی میں شوکت اسلام کا مظاہرہ کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی ہفتہ بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ترکی میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ اور اب ترکی میں اسلام پر مقدمہ چل رہا ہے۔ اور استغاثہ کا ملی سلامت پارٹی کے اکابر و ارکان کے خلاف الزام یہ ہے کہ یہ پارٹی اسلامی شریعت کا نفاذ چاہتی ہے۔

دوسری طرف اسلام کی تحریک ترکی کی نئی نسل کے اندر اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ اب مارشل لا، سنگین مقدمات اور تشدد اور دباؤ سے بوجھل ماحول کے باوجود نوجوان قوتوں میں بڑا ایمانی جذبہ ہے۔ ترکی کی نئی نسل سے اسلام کی وابستگی کی صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ موجودہ مارشل لا کی حکومت نے یہ احکام جاری کیے ہیں کہ عورتیں پردہ استعمال نہیں کر سکتیں اور خاص طور پر طالبات کو پردہ اوڑھ کر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں آنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے جواب میں سینکڑوں طالبات اور ان کے والدین نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بحوالہ: المجتمع، کویت ۔ ۵ مئی ۱۹۸۱ء

استدراک

مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۸۱ء کو پروفیسر اربکان اور ان کے ۹ ساتھیوں کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بالاقساط ان کے ۲۴ دوسرے ساتھی ملزموں کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ زیادہ تر داخلی اور کسی قدر خارجی حالات کے تحت مصلحتاً یہ کارروائی کی گئی ہے۔ مگر غالباً پالیسی یہ ہے کہ مقدمے کو طول دیا جائے اور پھر قید کی سزائیں دے کر "ملزمین" کو انتخابی سیاست پر اثر انداز ہونے سے روکا جائے۔

(ادارہ)

زلیخا کے بارے میں ایک بحث

جناب پروفیسر عبدالحفیظ صاحب

تفہیم القرآن کے صفحہ ۳۹۰ — ۳۹۱ پر، یوسف از زلیخا کے بارے میں لکھا ہے:

"مگر یہ جو ہمارے ہاں شہرت ہے کہ بعد میں اس عورت سے حضرت یوسفؑ کا نکاح ہوا، اس کی کوئی اصل نہیں ہے، نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلی تاریخ میں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کے مرتبے سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جس کی بدچلنی کا اس کو ذاتی تجربہ ہو چکا ہو۔ قرآن مجید میں یہ قاعدۂ کلیہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۔ بری عورتیں برے مردوں کے لیے ہیں اور برے مرد، بری عورتوں کے لیے۔ اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد، پاک عورتوں کے لیے۔"

سوال یہ ہے کہ زلیخا پر "اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ......" کا اطلاق کیونکر ہو سکتا ہے۔ جب کہ سورۂ یوسف کی آیات ۵۱، ۵۲، ۵۳ کی رو سے علمائے امت کی ایک بڑی جماعت زلیخا کی توبہ کی قائل ہے۔

زلیخا پر "اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ....." کو منطبق کرنے سے پہلے، ارادۂ گناہ اور ارتکابِ گناہ میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگرچہ گناہ کا ارادہ زلیخا میں تھا لیکن دوسری جانب عفت و عصمتِ نبوت اور حفاظتِ الٰہیہ کی وجہ سے گناہ کا وقوع نہ ہو سکا۔ اب دیکھیے گناہ کر کے توبہ کی توفیق مل جائے تو بھی

معافی ہو جاتی ہے جو جلد ہے کہ ابھی گناہ کا وقوع ہوا بھی نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر کسی کا مطمحِ نظر صرف شہوت یا جنسی خواہشات ہی ہوں تو وہ اپنی خواہشات کی تکمیل دوسرے افراد سے بھی کر سکتا ہے۔ مصر کی اُس وقت کی مخلوط سوسائٹی میں اس کے مواقع اور بھی زیادہ تھے۔ لیکن کہیں سے بھی یہ ثبوت نہیں ملتا کہ زلیخا نے کسی اور سے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا عام شہوت پرست اور جنسی خواہشات کی بھوکی نہ تھی۔ بلکہ یوسف علیہ السلام کے مافوق العادہ حسن سے مرغوب و ... نہ ہو گئی تھی۔ اس لیے زلیخا کو اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ...... کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ علمائے اُمت کی ایک کثیر تعداد یوسف علیہ السلام اور زلیخا کی تزویج کی قائل ہے۔ اندریں صورت زلیخا پر اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ کو منطبق کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

آیئے علی الترتیب ان نکات کا جائزہ لیں جن کی بنا پر تفہیم القرآن کی ایک عبارت کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔

(۱)

پہلی بات کہ علمائے اُمت کی ایک کثیر تعداد، زلیخا کی توبہ کی قائل ہے، وہ اِن آیات کی بنا پر ہے۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔

(سورہ یوسف ۵۲-۵۳)

جو حضرات، زلیخا کی توبہ کے قائل ہیں وہ اِن آیات کو زلیخا کا قول سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِن کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ آیا یہ کلامِ یوسف ہے یا زلیخا کا قول ہے۔ جنہوں نے اسے امراۃ العزیز کا کلام کہا ہے، اُن میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ "لیعلم" کا فاعل کون ہے؟ عزیز مصر یا یوسف؟ "یعلم" کا فاعل عزیزِ مصر بتلانے والوں کے نزدیک ان آیات کا ترجمہ ہوتا:-

" یہ اس لیے کہتی ہوں کہ (عزیز مصر) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے پسِ پشت اس کی خیانت نہیں کی اور اللہ خیانت کرنے والوں کی چالوں کو چلنے نہیں دیتا۔

اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتی۔ کیونکہ نفس تو برائی پر اکسایا ہی کرتا ہے بجز اس کے جس پر، پروردگار، رحم کرے۔ میرا رب تو غفور و رحیم ہے"۔

● "یہ اس لیے کہتی ہوں"، کا مشارٌ الیہ اس سے پہلی آیت میں ہے:

أَنَا رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَإِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ٥

(وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ بے شک وہ بالکل سچا ہے)۔

اِن آیات کو کلامِ زلیخا ماننے کے لیے درج ذیل نکات مانع ہیں:

ا۔ " یہ اس لیے کہتی ہوں کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے ......" لیکن عزیز مصر، پر تو شاہی دربار میں تحقیقات سے پہلے ہی "شاہد" کی شہادت کی وجہ سے یوسفؑ کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی۔ اور وہ اپنی بیگم کے قصور کا معترف بھی ہو چکا تھا۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۲۸ يُوْسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ - ۲۹ -

(جب شوہر نے دیکھا کہ یوسفؑ کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا: " یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں، واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف! اس معاملے سے درگذر کر، اور اے عورت! تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطا کار تھی)

اس لیے یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ یوسفؑ کی سچائی کے اعتراف کی غایت یہ ہو کہ عزیز مصر جان لے کہ امراۃ العزیز بالکل بے گناہ ہے، اس کی عدم موجودگی میں اس نے، اس کی خیانت نہیں کی۔ یہ تو بالکل بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے۔ اپنی بیوی کے مکر و فریب سے واقف خاوند کے سامنے، بیوی کی برأت و صفائی کی کیا وقعت ہے؟ یوسف کی صداقت کا اعتراف کرنے سے زلیخا کے اپنے

افعال کی شناعت کیسے کم ہوتی ہے ؟

۲ ــــ یوسف کی پاکدامانی کوئی ڈھکی چھپی حقیقت تو نہیں رہ گئی تھی، جس کا انکشاف پہلی بار دربارِ شاہی میں ہوا۔ بیگماتِ مصر کے سامنے امراۃ العزیز نے یہ کہا تھا :

ولقد راودته عن نفسه فاستعصم ط

(بے شک میں نے اُسے رِجھانے کی کوشش کی تھی، مگر یہ بچ نکلا)۔

یہاں "راودته" (میں نے اُسے رِجھانے کی کوشش کی) ، کا اعتراف، ندامت و شرمساری کی وجہ سے نہیں کر رہی ہے بلکہ یہ زنانِ مصر کے طعنوں کے جواب میں کہتی ہے کہ :

"دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جس کے معاملے میں تم مجھ پہ باتیں بناتی تھیں"۔

یعنی اِس کو پھسلانے، رِجھانے اور اس پہ ڈورے ڈالنے پہ میں حق بجانب ہوں، کیا ہوا اگر یہ غلام ہے، جوانِ رعنا تو ہے۔

شاہی دربار میں بھی وہ یہی لفظ "راودته" استعمال کر رہی ہے۔ یہاں بھی وہ یہ کہتی ہوئی نادم و شرمسار نہیں ہے۔ یہاں تو وہ اِس وجہ سے یہ بتا رہی ہے :

قالت امرأت العزيز الئٰن حصحص الحق ــــ ۵۱

(عزیز کی بیوی بول اُٹھی، اب تو سچ کُھل چکا ہے)

یوسف کی سچائی کو وہ اب حق کُھل چکنے کی وجہ سے بیان کرنے پر مجبور تھی۔ ایک تو بیگماتِ مصر کی گواہی کی وجہ سے :

قلن حاش لله ما علمنا عليه من سوء ــــ ۵۱

(سب نے یک زبان ہو کر کہا، "حاشا للہ، ہم نے تو اُس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا)۔

دوسرے بادشاہ کی اپنی تفتیش کی وجہ سے، جس پر قرآن کے یہ الفاظ روشنی ڈال رہے ہیں :۔

قال ما خطبكن اذ راودتن يوسف عن نفسه ط

(تمہارا کیا تجربہ ہے اُس وقت کا جب تم نے یوسف کو رِجھانے کی کوشش کی تھی)

اب اگر وہ یوسف کی پاک دامانی تسلیم نہ بھی کرتی تو اُس کی وقعت کیا ہوتی ؟

ایسے لگتا ہے اُس مخلوط مصری سوسائٹی میں ڈورے ڈالنا پھسلانا یعنی HOOKING اور

CHASING کوئی برا فعل یا معیوب عمل متصور نہیں ہوتا تھا ۔ بلکہ یہ ایک معمول کا فن بن گیا تھا ۔ بیگمات مصر نے زلیخا کو یہ طعنہ نہیں دیا تھا کہ وہ ڈورے کیوں ڈال رہی ہے، بلکہ اعتراض یہ تھا کہ نوجوان غلام کے پیچھے فریفتہ کیوں ہو رہی ہے، کسی صاحب حیثیت، اعلیٰ خاندان کے شہزادے پر فریفتہ ہوتی ۔ اس لیے "راودتہ" کہتے ہوئے اس نے نہ تو عورتوں کی بھری محفل میں شرم محسوس کی اور نہ دربار شاہی میں ۔

۳۲ ۔ "میں نے پس پشت اس (عزیز مصر) کی خیانت نہیں کی" ۔ حالانکہ وہ اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں (بالغیب) دعوت گناہ دے کر خیانت کی مرتکب ہو چکی تھی ۔ یہ دعوت گناہ کی خیانت ایک بار نہیں، دوسری بار شہر کی عورتوں کے سامنے کی ۔ گناہ کی دعوت ہی نہیں، انکار دعوت پر قید کی دھمکی بھی تھی ۔ یعنی حکماً برائی کے لیے کہا جا رہا ہے :

وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصَّاغِرِينَ ۔ ۳۲

(اگر یہ میرا کہا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہوگا) ۔

یہ تو عصمت نبوت کا کمال ہے کہ یوسفؑ ملوث نہ ہوئے ورنہ زلیخا نے تو اپنے آپ کو دعوت عیش کے لیے پیش کر ہی دیا تھا ۔ اس میں زلیخا کا "خیانت" نہ کرنے کا فعل اپنی طرف منسوب کرنا چہ معنی دارد ؟ پہلے یوسفؑ کے بارے میں زلیخا نے کہا : وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ (بے شک وہ بالکل سچا ہے) اور اب وہ اپنے بارے میں فرماتی ہیں : أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ (میں نے پس پشت ـــــ عزیز مصر کی خیانت نہیں کی) ۔ اگر سچائی کا فاعل یوسفؑ ہے تو خیانت نہ کرنے کا فاعل بھی یوسفؑ ہونا چاہیے تھا نہ کہ زلیخا ـــــ "اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتی"، حالانکہ "خیانت نہ کرنے کا فعل" اپنی طرف منسوب کر کے وہ اپنے نفس کو بری ٹھہرا رہی ہے ۔ پہلے زلیخا انا راودتہ عن نفسہ (وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی) کہہ کر اپنی خیانت اور گناہ کا اقرار کر رہی ہے ۔ درمیان میں انی لم اخنہ بالغیب (میں نے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی)، کہہ کر اپنے گناہ کا انکار کر رہی ہے ۔ پھر آگے "وما ابری نفسی" کہہ کر اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہرا رہی ۔ یعنی ایک ہی سانس میں اقرار، انکار اور پھر اقرار ۔ کم از کم قرآن کا اجمال و کمال و جمال ایسی بے جوڑ باتوں سے عاری ہے ۔

قرآن تو ایسے تضاد کا بالکل روادار نہیں ہے۔ یہ التباس زیرِ غور اقتباس کو قول زلیخا ماننے ہی کی وجہ سے پیش آ رہا ہے۔

۴ ـــ اگر "لیعلم" کا مرجع، حضرت یوسف علیہ السلام کو مانا جائے تو آیت ۵۲ کا ترجمہ ہو گا:

"یہ اس لیے کہتی ہوں کہ (یوسف) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی اور اللہ تو خیانت کرنے والوں کی چالوں کو چلنے نہیں دیتا۔"

یہاں "یوسف کی خیانت" کے کیا معنی؟ کیا صداقتِ یوسف کا اعتراف نہ کرنا خیانت ہوتی؟ کیا عصمتِ یوسفؑ کا اعتراف نہ کرنا خیانت ہوتی؟ ایسا تو بیگم نوطیفار نہ کر سکتی تھی، کیونکہ اس کے اپنے بقول "حصحص الحق" (حق کھل چکا تھا)۔ عزیزِ مصر خود، یوسفؑ کی بے گناہی کا قائل ہو چکا تھا۔ بیگماتِ مصر اس کی گواہی دے چکی تھیں۔ خود بادشاہ، حقائق سے واقف ہو چکا تھا اور تو اور زلیخا خود زنانِ مصر کو دی گئی دعوت میں "فاستعصم" (مگر یہ بچ نکلا) کہہ چکی تھی۔ اب وہ کس منہ سے اِس حقیقت کا انکار کرتی؟

اِن دلائل کی رُو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سورۂ یوسف کی آیات ۵۲ ـ ۵۳ کو قول امراۃ العزیز ماننا ناممکن ہے۔ جب یہ قول زلیخا نہیں تو پھر توبۂ زلیخا کی بنا کونسی رہ گئی؟ زیرِ بحث آیات قولِ یوسفؑ ہیں۔ اس میں کوئی تضاد نہیں اور سیاق و سباق میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ ملاحظہ ہو:

(یوسف نے کہا:) "اس سے میری غرض یہ تھی کہ (عزیز) یہ جان لے کہ میں نے در پردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں اُن کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے اِلّا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔"

"اِس سے میری غرض" (ذٰلک) کا مشارٌ الیہ، تحقیقات کا وہ مطالبہ ہے جو حضرت یوسفؑ نے اِن الفاظ میں کیا تھا:

"جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اُس نے کہا،

"اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ اُن عورتوں کا کیا معاملہ ہے،
جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو اُن کی مکاری سے واقف ہی ہے"۔
(آیت ـ ۵۰)

اِس اقتباس کو یوسفؑ کا کلام ماننے پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یوسفؑ تو ابھی بادشاہ کے پاس پہنچے ہی نہیں تھے۔ پھر یہ بات انھوں نے، اُس کے سامنے کیسے کر دی؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ عدالتی تحقیقات کا مطالبہ، یوسفؑ نے بالمشافہ بادشاہ سے نہیں کیا تھا، بلکہ اس کے بھیجے ہوئے پیغام بر کے ذریعے کیا تھا۔ اور پیغام لانے والا بھی وہ جو یوسفؑ کے جیل کا ساتھی تھا۔ اِس کے دوبارہ جیل میں یوسف کے پاس جا کر تحقیقات کے نتائج بتلانے پر یوسفؑ کے لیے اس عدالتی تحقیقات کی غرض و غایت بیان کرنا ضروری تھا تاکہ اُس پیامی کو اور اُس کے ذریعے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یعنی یوسفؑ کسی اخلاقی جرم کی بنا پر جیل نہیں ڈالے گئے تھے۔ یعنی یوسفؑ نے یہ بات بادشاہ سے نہیں پیامی سے کہی تھی۔

دوسرا اعتراض اس پر یہ کیا جا سکتا ہے کہ جب عزیز مصر پر واضح ہو چکا تھا، یوسفؑ بے گناہ ہے اور اصل قصور، اُس کی بیوی کا ہے تو دوبارہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ:

"(عزیز) یہ جان لے کہ میں نے در پردہ اُس کی خیانت نہیں کی تھی....."

اِس کا جواب یہ ہے کہ بے شک حضرت یوسفؑ کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود جیل میں ڈال کر دامنِ نبوت کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ نبوت کے کام کے لیے ضروری تھا کہ یوسفؑ بالکل بے داغ ہو کر لوگوں کے سامنے آئیں اور یہ کام عدالتی تحقیق کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا۔

یہ تو تھی پہلے اعتراض کی حقیقت کہ زلیخا تائب ہو چکی تھی لہٰذا وہ "اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ....." کے زمرے میں کیسے شامل ہو سکتی ہے؟

(۲)

آیئے دیکھتے ہیں دوسرے اعتراض کو کہ زلیخا پر "اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ" کو منطبق کرنے سے پہلے ارادۂ گناہ اور ارتکاب گناہ میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

زلیخا کے ہاں گناہ کا ارادہ ہی نہ تھا، بلکہ اُس نے بُرے مقصد کے حصول کے لیے عمل بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن یہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ گناہ کے ارادے اور ارتکاب میں صرف دو نقطے ہی نہیں ہیں۔ ان کے درمیان کی کڑیاں بھی پیشِ نظر رکھیے۔ ارادہ یا نیت تو عمل کی بنیاد اور محرک ہوا کرتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں، زلیخا نے صرف ارادۂ گناہ کیا تھا یا اُس کی تکمیل کے لیے کچھ اعمال و افعال بھی "پھسلاوٹ میں برابر لگی رہی"، نرا ارادہ نہیں تھا، یہ ایک عمل تھا اور اس کا محرک گناہ کا ارادہ تھا۔ "سب دروازوں کو اچھی طرح بند کر دیا" یہ ارادہ نہیں بلکہ اس کی تکمیل کے لیے ایک عمل تھا۔ "اور بولی آؤ، اپنا کام کرو"، محض ارادہ تھا؟ نہیں، دعوتِ گناہ کے لیے بلاوا تھا اور یہ بلانا خود ایک عملِ گناہ ہے۔ "وہ اُس کی طرف بڑھی"۔ اور یہ غیر مرد کی طرف بُرے ارادے سے بڑھنا کیا صرف ارادہ تھا؟ نہیں یہ بُرے مقصد کی تکمیل کے لیے سعی و جہد تھی اور یہ کوشش بجائے خود فعلِ قبیح ہے۔

امام راغب، مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:۔

الخبث والخبیث: ہر وہ چیز جو ردّی اور خسیس ہونے کی وجہ سے بُری معلوم ہو۔ خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات (یعنی عقاید و خیالات) سے تعلق رکھتی ہو۔

"الخبیثات والخبیثین" کی تشریح میں لکھتے ہیں،

"یعنی افعال قبیحہ اور آوارہ کام، یہ بد باطن اور آوارہ لوگ ہی کرتے ہیں"۔

آپ نے دیکھا کہ خباثت کا اطلاق صرف گناہ کی انتہا ہی پر نہیں ہوتا بلکہ گناہ کے محرک ارادے، خیال اور اس تک پہنچنے والے افعال پر بھی ہوتا ہے۔ "ڈورے ڈالنے" سے لے کر "اُس کی طرف بڑھنے" تک کے مدارج میں خباثت نہیں تھی، قباحت نہیں تھی؟ "راودتہ" سے لے کر "ولقد ھمت بہ" تک خباثت ہی خباثت اور قباحت ہی قباحت ہے۔

قرآن نے تو امراۃ العزیز کی دعوتِ گناہ کے فعل کو بدی اور فحاشی سے تعبیر کیا ہے اور یہ چودہ سو سال سے اس کی تلاوت و تفسیر ہو رہی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اِس فعلِ منکر کو سُوء اور فحشاء کہہ رہا ہے تو آج اگر اِس کی روشنی میں کوئی "اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ......" کا اصول قرآنی یاد دلا دے تو کیا مضائقہ ہے؟

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ط

(ایسا ہوا، تاکہ ہم (یوسف) سے بدی اور بے حیائی دُور کر دیں)۔

یہ بات کہ زلیخا کو گناہ سے توبہ کی توفیق مل گئی تھی۔ اس کی قرآن سے تائید نہیں ہوتی بلکہ وہ اُس گناہ پہ اصرار کی تصویر پیش کرتا ہے۔ قرینہ کی گواہی اپنی بیوی کے خلاف پڑتے دیکھ کر عزیز مصر اُسے کہتا ہے:

"..... اور اے عورت! تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطا کار تھی"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امراۃ العزیز اپنی خطا کی معافی مانگتی لیکن بیگماتِ مصر کے سامنے پوری ڈھٹائی سے بولی:

"اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا"

اگر زلیخا تائب ہو گئی تھی تو پھر قرآن کے ذریعے اُس کے بُرے افعال کا یوں چرچا کیوں؟

(۳)

اب آیئے تیسری بات کی طرف کہ "زلیخا عام شہوت پرست اور جنسی خواہشات کی بھوکی نہ تھی"۔ یہ نہ بھولیے کہ زلیخا شادی شدہ تھی، شوہر دار تھی۔ وہ تو طیفار کی بیوی، عزیز مصر کی بیگم تھی۔ یوسف کے مافوق العادہ حسن سے مرعوب و متاثر ہونا اُس کے لیے معذرت نہیں بلکہ یہ تو اُس کے گناہ کی شناعت اور شدت میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔ اپنی جنسی شہوت بجھانے کے لیے اُس کے پاس جائز ذریعہ موجود تھا۔ اپنے شوہر کے علاوہ، جنسی خواہش کا اظہار، اُس کے شہوت پرست اور جنسی خواہشات کی بھوکی ہونے کے لیے کتنا واضح اور بیّن ثبوت ہے۔ "یوسف کے علاوہ" نہیں، "شوہر کے علاوہ"، اپنی جنسی آگ بجھانے کے لیے کسی کو طلب کرنا کیا خیانت نہیں، فحاشی نہیں، بدی نہیں؟

(۴)

چوتھی دلیل کہ علمائے اُمت کی ایک کثیر تعداد، یوسف اور زلیخا کی تزویج کی قائل ہے، اس لیے نبی کی بیوی کی حیثیت سے وہ "اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ" میں قطعاً شامل نہیں کی جاسکتی-

اصل بات تو یہی ہے جس کے دفاع کے لیے تو یہ زلیخا کے لیے تاویلیں دی جارہی ہیں ۔ بات علمائے امت کی نہیں، علمائے اُمت کے علم کی ہے اور علم کے ذرائع اور ماخذ ہیں ۔ یہ ماخذ اور ذرائع قرآن، حدیث، تاریخ کے علاوہ کتب سابقہ ہیں ۔ لیکن ان میں کہیں بھی یوسفؑ، زلیخا کی تزویج کا ذکر نہیں۔ غلط فہمی کی بنا پر اگر علمائے اُمت نے ایک غلط بات لکھ دی ہے تو کیا اس بات کو علما کے تقدس کی وجہ سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

علامہ منصور پوری، اس تزویج کے افسانے کی حقیقت بیان کرتے ہیں ۔ الجمال والکمال ص ۱۵۹-۱۶۰

" لوگوں نے بنا لیا ہے کہ پھر یہ عورت از سرِ نو جوان بنائی گئی ۔ پھر یوسفؑ صدیق کے نکاح میں آگئی تھی ۔ مگر اس امر کے ثبوت میں کوئی صحیح روایت اسلامی یا اسرائیلی موجود نہیں ہے۔

فخر رازیؒ نے تفسیر میں تحریر فرمایا ہے کہ یہی امراۃ العزیز، حضرت یوسفؑ کے دونوں فرزندوں منشی و افرائیم کی والدہ ہے لیکن تورات سے اس قیاس کی تردید ہوتی ہے۔

کتاب پیدائش ۴۱ باب ۵۰ تا ۵۲ درس میں تو یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شہر اُون کے کاہن مسمی فوطی فرع کی دختر مسماۃ آس ناتھ سے نکاح کیا تھا اور ما کو رہ بالا ہر دو پسر اُس کے بطن سے ہیں ۔ ہمارے علمائے بزرگ کو غالباً اس لیے مغالطہ ہوا کہ العزیز کا نام فوطی فار تھا اور اُس کاہن کا نام فوطی فرع تھا یہ دونوں نام بہت زیادہ متشابہ الصوت ہیں۔

لیکن جب مؤرخ غور کرے گا تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں کی شخصیت میں بہت بڑا فرق ہے۔

فوطی فرع کاہن تھا یعنی امام مذہب، اُس کی دختر کنواری تھی۔ اُس کا نام آس ناتھ تھا۔ فوطی فار، فرعون کے جلوداروں کا سردار تھا۔ اُس کی عورت بیوہ یا مطلقہ ہو سکتی ہے اُس کا نام لوگوں نے زلیخا یا راعیل بنایا ہے۔ پھر یہ دونوں عورتیں ایک کیونکر سمجھی جا سکتی ہیں۔

استدلال بالا کے بعد جو تاریخی ہے اور بائیبل کی تصدیق سے مضبوط ہے، ہم یہ بھی لکھ دینا چاہتے ہیں کہ " اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ اور اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ کا

اصول ایک زبردست ہے جو نا ممکن ٹھہراتا ہے کہ کسی نبی یا رسول کے پہلو میں ایسی عورت پائی جائے جو حیا باختہ ہو۔

امراۃ لوط اور امراۃ نوح بھی ہم کو یاد ہیں۔ اِن دونوں کی خیانت کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے میکے والوں کو اور اپنی قوم کو اپنے اپنے شوہر کے خلاف مدد دی تھی۔ لیکن اِن دونوں عورتوں کی عصمت کے خلاف تو کسی روایت میں ایک حرف بھی موجود نہیں؟

اِسی کی تائید صاحب تفہیم القرآن سید مودودیؒ کی اس تحریر سے ہوتی ہے:۔

"رہا زلیخا سے حضرت یوسفؑ کا نکاح تو اس افسانے کی بنیاد صرف یہ ہے کہ بائبل اور تلمود میں فوطیفرع کی بیٹی آسناتھ سے اُن کے نکاح کی روایت بیان کی گئی ہے اور زلیخا کے شوہر کا نام فوطیفار تھا۔ یہ چیزیں اسرائیلی روایات سے نقل در نقل ہوتی ہوئی مفسرین تک پہنچیں اور جیسا کہ زبانی افواہوں کا قاعدہ ہے، فوطیفرع بآسانی فوطیفار بن گیا، بیٹی کی جگہ بیوی کو مل گئی اور بیوی لامحالہ زلیخا ہی تھی۔ لہٰذا اس سے حضرت یوسفؑ کا نکاح کرنے کے لیے فوطیفار کو مار دیا گیا اور اس طرح "یوسف زلیخا" کی تصنیف مکمل ہوگئی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد دوم صفحہ ۴۲۴)

امام ابن تیمیہؒ

۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ

از جناب عبدالرشید عراقی

(۳)

فتنۂ عقائد قرآن مجید میں ہر ایک مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں، اُس کے رسولوں اور یومِ آخرت، قضاء و قدر، قیامت، بعث بعد الموت اور جزا و سزا پر ایمان لائے۔ کیونکہ ان پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص بھی مومن اور مسلمان نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کے تمام اعمال کی بنیاد انہی عقائد پر ہے۔ ان پر ایمان لائے بغیر ان کا ہر ایک عمل بیکار ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ایمان کے ساتھ ساتھ عمل پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور عقائد کی صرف اُنہی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے جو انسان کے دل و دماغ اور اُس کے عبادات اور اعمال و اخلاق کی اصلاح اور درستگی سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ عام لوگوں کے ذہن نشین ہو جائیں۔

امام ابن تیمیہؒ نے یہودیت و نصرانیت کی تردید کے ساتھ ساتھ شرک و بدعت کی تردید کی، شیعہ عقائد کی حقیقت واضح کی ___ اور صوفیہ پر تنقید کی۔ اور کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کی تردید کی۔ اور اس تردید میں شیخ محی الدین ابن عربی کے مسلک پر برملا تنقید ہوتی تھی۔ مصر و شام میں ایک گروہ تھا جو شیخ ابن عربی کو نہایت بلند پایہ عارف، محقق اور امام مشربِ توحید اور شیخ اکبر مانتا تھا۔

چنانچہ امام صاحب نے شیخ ابن عربی کی کتابوں خصوصاً فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم کا

منظر نامہ مطالعہ کیا۔ اور اس کے بعد عوام کے سامنے شیخ ابن عربی کا مسلک پیش کیا۔ چنانچہ امام صاحب فرماتے ہیں :

ابن عربی اور ان کے متبعین کا مسلک یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے۔ وہ کہتے ہیں، مخلوق کا وجود خالق کا وجود ہے۔ وہ دو متغائر موجودوں کے قائل نہیں جن میں سے ایک دوسرے کا خالق ہو، بلکہ کہتے ہیں کہ خالق ہی مخلوق ہے۔ وجود میں رب وعبد کی کوئی تفریق نہیں۔ وہاں نہ کوئی خالق ہے اور نہ کوئی مخلوق، نہ کوئی داعی، نہ کوئی مجیب، وجود کا جب اعیان پر فیضان ہوا تو اس نے اس کے اندر ظہور کیا اور اعیان کی حیثیت سے اس میں تنوع اور تفریق پیدا ہوئی جیسے کہ روشنی مختلف الالوان شیشوں میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون کو جو ٹوکا تھا تو اس بات پر کہ انھوں نے گوسالہ پرستی کی جو دراصل خدا پرستی تھی (اس لیے کہ موجود تو ایک ہی ہے) مخالفت کیوں کی۔ ان کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام ان عارفین میں سے تھے جو ہر چیز میں حق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسرِ حق تھا کہ "انا ربکم الاعلیٰ" بلکہ وہ عین حق تھا[1]

صاحب فصوص کا کہنا ہے کہ فرعون کو چونکہ (تکوینی طور پر) منصب حکومت حاصل تھا اور وہ صاحب وقت تھا تو اس نے بجا طور پر انا ربکم الاعلیٰ کہا۔ اس لیے کہ جب سب کسی نہ کسی نسبت سے ارباب ہیں تو میں ان میں سب سے اعلیٰ ہوں۔ کیونکہ مجھے ظاہر میں تم پر حکومت کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جادوگروں کو جب فرعون کی صداقت کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کا اعتراف کیا اور کہا اقض ما انت قاض انما تقضی ھذہ الحیوٰۃ الدنیا (جو تمہیں فیصلہ کرنا ہو کرو۔ تم اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتے ہو) اس لیے فرعون کا یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ انا ربکم الاعلیٰ۔ اور فرعون عین حق پر تھا۔

[1] تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم صفحہ ۴۷، بحوالہ فصوص الحکم

ابن عربی حضرت نوح علیہ السلام پر تنقید کرتے ہیں اور اُن کی کافر قوم کی تصویب و تعظیم جنہوں نے پتھروں کی پرستش کی۔ وہ کہتے ہیں کہ (ان بت پرستوں نے) درحقیقت اللہ ہی کی عبادت کی تھی۔ اور یہ طوفان دراصل معرفتِ الٰہی کی طغیانی اور اس کے سمندر کا جوش تھا جس میں وہ غرق ہوئے[1]۔

یہاں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امام صاحب کے زمانے میں "وحدت الوجود" کے عقیدہ میں غلو پیدا ہو گیا تھا اور لوگ اس سلسلہ میں عقل و اخلاق کے حدود پھلانگ گئے تھے۔ اور ایک بحرانی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

چنانچہ اس صورتِ حال کے پیش نظر امام ابن تیمیہؒ نے وضاحت کی۔

"اس سلسلہ میں ایک جماعت (جس کو علم کلام، فلسفہ اور تصوف سے واقفیت تھی) بہت زیادہ گمراہ ہوئی۔ ان میں ابن سبعین، صدر الدین قونوی (تلمیذ ابن عربی) اور بلیانی اور تلمسانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں تلمسانی اس مسئلہ کے علم و معرفت میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ مذہب وحدۃ الوجود کا صرف قائل ہی نہ تھا بلکہ اس پر عامل بھی تھا۔ چنانچہ شراب پیتا تھا اور محرمات کا ارتکاب کرتا تھا (کہ جب موجود ایک ہے تو حلال و حرام کی تفریق کیسی)۔

مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ وہ تلمسانی سے فصوص الحکم کا درس لیتے تھے۔ اور اس کو اولیاء اللہ اور عارفین کا کلام سمجھتے تھے۔ جب انہوں نے فصوص کو پڑھا اور دیکھا کہ اس کے مضامین تو قرآن شریف کے صریح مخالف ہیں تو انہوں نے تلمسانی سے کہا کہ یہ کلام تو قرآن مجید کے مخالف ہے تو اس نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہوا ہے۔ اس لیے کہ وہ رب و عبد کے درمیان فرق کرتا ہے۔ توحید تو ہمارے کلام میں ہے۔ اس کا یہ بھی مقولہ ہے کہ کشف کے ذریعہ وہ ثابت ہوا ہے جو صریح عقل کے خلاف ہے[2]۔"

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۷۶ بحوالہ الفرق بین الحق والباطل ابن تیمیہ صفحہ ۱۴۵

[2] ایضاً

امام صاحب نے اس سلسلہ میں کئی رسالے لکھے۔ جن میں صوفیہ کے عقائد و اعمالِ باطلہ کی پُرزور تردید کی اور اس کے ساتھ آپ نے مصر کے شیخ ابو الفتح نصر المنبجی (م ۷۱۹ھ) کو ایک طویل خط لکھا، جس کی مجلس میں مسئلہ وحدۃ الوجود زیر بحث آیا تھا۔ اور اس نے امام صاحب پر تنقید کی تھی۔ امام صاحب نے اس خط میں تفصیل سے صوفیہ کے عقائد کی قلعی کھولی۔

امام صاحب کی اس جد وجہد سے نام نہاد صوفیہ کے اندر ایک کھلبلی سی مچ گئی اور انہوں نے امام صاحب کے قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے ہوئے دلائل کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ امام صاحب کی تحریروں اور تقریروں کی غیر معمولی قوت محسوس کر رہے تھے اور بالآخر انہیں امام صاحب کی علمی جلالت کا اعتراف کرنا پڑا۔ [1]

امام ابن تیمیہ رح کا دورِ ابتلاء

ایک طرف دشمن آپ کے علمی جلالت کا اعتراف کر رہے تھے اور دوسری طرف در پردہ آپ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے کہ حضرت امام نے صوفیہ پر جو تنقید کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس کی سزا امام کو ملنی چاہیے۔ چنانچہ حاسدوں نے اس سلسلہ میں اپنی سرگرمیوں کو شروع کر دیا تھا، جیسا کہ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے:۔

"شیخ تقی الدین (امام ابن تیمیہ رح) سے فقہاء کی ایک جماعت جلا کرتی تھی۔ اس لیے کہ حکومت کی نگاہ میں وہ وقار کے حامل تھے۔ عوام ان کے ارشادات پر سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ تن تنہا انجام دینا اُن کا شعار تھا۔ اسی کے باعث وہ لوگوں میں مقبول تھے۔ ان کے اتباع کی تعداد حدود شمار سے خارج تھی۔ ان کی حمیتِ مذہبی اور علم و عمل نے انہیں محسود بنا دیا تھا۔" [2]

امام صاحب کی سلطانِ مصر سے شکایت

چنانچہ مخالفین نے جس میں ابن عربی کے معتقدین زیادہ تھے سلطان سے شکایت کی کہ امام ابن تیمیہ رح صوفیہ کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں اور شیخ ابن عربی پر برملا تنقید کرتے ہیں۔ اور اُن کی قدر و منزلت کو گھٹا رہے ہیں۔ اور اُن کے افکار و آراء کا تار پود بکھیر رہے ہیں

---

[1] امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۴۲۳

[2] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ بحوالہ البدایۃ والنہایہ جلد ۱۴ صفحہ ۳۷

اس لیے ہم آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ امام صاحب کو ان پر نکتہ چینی کرنے اور تنقید کرنے سے روک دیا جائے۔

ابن تیمیہؒ مصر میں ۵ رمضان ۷۰۵ھ کو امام ابن تیمیہ کی طلبی کا فرمان دمشق پہنچا۔ چنانچہ امام صاحب اس شاہی فرمان کے بعد دمشق سے روانہ ہوئے اور ۲۲ رمضان کو آپ مصر پہنچے۔ حضرت امام کے پہنچنے سے قبل مخالفین کی شکایت پر سلطان قاضی القضاۃ بدر الدین بن جماعہ الشافعی کو حکم دے چکا تھا کہ وہ اس معاملہ کی تحقیق کر کے فیصلہ کریں۔

۱۰ شوال کو منگل کے دن قاہرہ میں ایک مجلس منعقد ہوئی، جس میں بہت سے علمائے کرام شامل تھے۔ شافعی عدالت کے سامنے امام ابن تیمیہ پر الزامات لگائے گئے اور عدالت سے انصاف کا مطالبہ کیا گیا۔ امام صاحب نے ان سب الزامات کی تردید کی اور ہر مسئلہ کا جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں دیا۔ دلائل اتنے واضح تھے کہ مدعی سے ان کا جواب نہ بن سکا۔ جرح کے سلسلہ میں مسئلہ استغاثہ پر بھی بحث ہوئی۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ امام صاحب نے اس مسئلہ پر مدلل تقریر کی اور اپنا نقطۂ نظر واضح کیا[1] اس پر لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بعض کہتے تھے کہ اس میں کیا حرج ہے۔ لیکن قاضی القضاۃ بدر الدین بن جماعہ نے کہا۔ یہ خلاف ادب ہے اور اس کی سزا انہیں ضرور ملنی چاہیے۔ مگر دوسرے علمائے کرام اس حق میں نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام صاحب کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکا[2]۔

امام صاحب کی دوبارہ شکایت جب اس مجلس میں مخالفین کا زور نہ چلا تو انہیں بہت تشویش ہوئی۔ کہ ہمارا وار خالی گیا ہے۔ اس لیے انہوں نے سلطان سے دوبارہ شکایت کی۔ حکومت نے مجبور ہو کر حضرت امام کے سامنے تین شرطیں پیش کیں۔

۱— وہ قاہرہ سے دمشق چلے جائیں اور وہاں چند شروط کے تحت زندگی بسر کریں۔

۲— قاہرہ سے اسکندریہ چلے جائیں اور وہاں چند شروط کے تحت زندگی گذاریں۔

---

[1] امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۳۴۵

[2] مقالات شبلی جلد پنجم صفحہ ۲۷

۳۔ اگر یہ دونوں شرطیں منظور نہیں تو جیل جائیں[۱]

چنانچہ شیخ الاسلام نے تیسری شرط کو منظور کیا اور امام صاحب داخل زنداں ہو گئے۔ اور حضرت امام کے جیل جانے سے حنابلہ پر بھی آفت آ گئی۔ جیسا کہ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

امام ابن تیمیہ کے جیل جانے سے دیار مصر میں حنابلہ کو بہت زیادہ اہانت اور ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا[۲]

غرض امام صاحب جیل چلے گئے۔ مگر اس کے ساتھ امام صاحب کا احترام قائم رہا۔ خدام کو اُن کے ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی۔ ہر شخص اُن کے پاس آنے جانے کا مجاز تھا۔ چنانچہ مشکل مشکل فتوے لوگ لے کر آتے تھے اور امام صاحب اُن کے جواب لکھتے تھے۔ اکثر لوگ برکت کی غرض سے ملنے جاتے تھے۔ خاص اُن کے یارانِ صحبت کو بھی آزادی حاصل تھی۔ بے تکلف اُن سے مل سکتے تھے[۳]

مشروط رہائی کی پیشکش

امام ابن تیمیہ رح ایک سال تک سجن زنداں کے مصائب برداشت کرتے رہے۔ آخر جفا کاروں کے ضمیر میں خلش پیدا ہوئی۔ اور امام صاحب کو رہا کرنے کا مسئلہ زیر غور آیا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ امام صاحب کو رہا کرا یا جائے۔ لیکن چند شرائط کے ساتھ۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے بعض عقائد سے رجوع کر لیں۔ چنانچہ امام صاحب کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے مشروط رہائی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس آدمی ۶ دفعہ آئے۔ مگر آپ نے انکار کیا۔ جیسا کہ امام ابن کثیر لکھتے ہیں:

آخر یہ لوگ حصولِ مقصد میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے[۴]

اور حضرت امام صاحب نے حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ میں ان بدخود غلط ناصحوں سے صاف صاف کہہ دیا۔

۱۔ امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۳۴۶۔

۲۔ حیات ابن تیمیہ رح ابو زہرہ صفحہ ۱۱۰۔ بحوالہ البدایہ والنہایہ جلد ۱۴ صفحہ ۳۸۔

۳۔ مقالات شبلی جلد پنجم صفحہ ۷۲۔

۴۔ حیات ابن تیمیہ ابو زہرہ صفحہ ۱۱۱۔

اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ (۱۲ — ۳۳)

(یہ لوگ جس طرف مجھے بلا رہے ہیں اس کے مقابلہ میں جیل کی زندگی مجھ کو زیادہ مرغوب اور پسندیدہ ہے)

امام صاحب کو جیل میں رہتے ہوئے ۱۸ ماہ گذر گئے۔ لیکن آپ نے مشروط رہائی کو قبول نہ کیا۔ آخر ایک عرب امیر ابن عیسیٰ کی کوشش سے آپ کو غیر مشروط رہائی ملی[1]

امام صاحب پھر جیل میں

رہائی کے بعد امام صاحب کا مصر میں طویل قیام کا ارادہ نہ تھا — مگر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ امام صاحب کا قیام مصر میں اپنے اندازے سے زیادہ ہوگیا اس قیام کے دوران آپ نے درس وتعلیم اور وعظ و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ اور آپ کے قیامِ مصر کے دوران ہی یہ مشاہدات آپ کے سامنے آئے کہ مصر میں سب سے زیادہ قوی اور توانا گروہ صوفیہ کا ہے۔ یہ لوگ وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ خالق اور مخلوق میں کسی تفریق کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہؒ نے ان صوفیوں کے عقائد باطلہ کی پُر زور تردید کی۔ اور کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں واضح دلائل سے ثابت کیا کہ یہ خیالات فاسدہ رکھنے والا دائرۂ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ حاسدین اور منافقین نے سازش کرکے امام صاحب کو دوبارہ جیل بھجوا دیا۔ اگلے سال شوال میں سلطان نے امام صاحب کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ اور آپ کو اسکندریہ طلب کیا[2]

(باقی)

---

[1] حیات ابن تیمیہؒ ابو زہرہ صفحہ ۱۱۵

[2] ایضاً صفحہ ۱۲۱

مطبوعات

قرار داد مقاصد سے
اسلامی قانون تک
مؤلف: ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی
ناشر: طاہر سنز - اردو بازار کراچی
قیمت: -/۳۰ روپے

بعض کتابیں ایک خصوصی سرمایہ مسرت بن کر آتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب یہ ہے۔ تاریخ پاکستان کے صرف ابتدائی ڈیڑھ سال (تقریباً) کے عرصے کو چھوڑ کر بقیہ پورے دور کی ایک شعور انگیز جاندار اور حرکت آموز تاریخ ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے بڑی حد تک مؤرخ کا پارٹ صحیح طور پر ادا کیا ہے۔ نہ کسی اہم عنصر کو نظر انداز کیا ہے اور نہ دانستہ کسی کے پارٹ کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کی مثالیں پہلے موجود ہیں۔ بعض تاریخیں تو یہ جواب ہی نہیں دیتیں کہ اچانک قرار داد مقاصد کیسے رونما ہوگئی جب کہ اس کے لیے قوم میں کوئی حرکت ہی نہ تھی۔ ان "لاجواب" تاریخوں میں ایک حرکت انگیز تاریخی قوت کو اسٹیج سے غائب کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اُسے سامنے لائے بغیر تحریک اسلامی دستور کا کوئی ہیولیٰ مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر صدیقی صاحب کے حُسنِ ترتیب و تحریر کی داد میں ان الفاظ میں دیتا ہوں کہ کتاب پڑھنے لگا تو یوں معلوم ہوا کہ ایک دلچسپ کہانی کی رَو میں بہتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا اوّلین اہم باب اسلامی دستور کے لیے قوم کی جد وجہد کی مؤرخانہ روئیداد ہے جو تاریخ پاکستان کی کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر غلام محمد، سکندر مرزا اور صدر ایوب کے ادوارِ ثلاثہ کے پیچیدہ احوال کی گرہ کشائی ہے، آخر میں حوادث کے اس بھنور کا ماہرانہ تجزیہ ہے، جسے ہماری تاریخ کی تین لہروں — یحییٰ، مجیب اور بھٹو — نے پیدا کیا۔

اب چند مشورے اس خیال سے عرض ہیں کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں ان کو ملحوظ رکھ کر اضافہ و ترمیم

سے کام لیا جا سکے۔

۱۔ لیڈروں کے ایسے تمام اقوال جو متن میں مذکور ہیں، اُن کا حوالہ متصلاً حاشیے میں ہونا چاہیے تھا۔ ۲۔ یہ بات صراحت و وضاحت سے آنی چاہیے تھی کہ اس ملک کو خراب کرنے میں اس کے حکمرانوں ہی کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ ۳۔ شروع میں ایک فصل کے اندر تشکیلِ پاکستان سے قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے تک کے دور کو مختصراً پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ ۴۔ دستور کے لیے سیکولرسٹ طبقے کے محاذ کا تجزیہ ذرا سا اور تفصیلی ہونا چاہیے تھا کہ کون کون سے عناصر کن کن طریقوں سے کام کر رہے تھے۔ ۵۔ دستوری تحریک کے دوران میں جو مغربی لٹریچر ہم پر برسایا جاتا رہا، خصوصاً یہودی مصنفین کی کتب، ایک باب میں ان پر نظر ڈالنی چاہیے تھی، کیونکہ اس لٹریچر کا مقصد سیکولرسٹ گروہ کی پشت پناہی تھا۔ ۶۔ ۱۹۵۳ء کے اضطرابات پنجاب اور اُس کی عدالتی تحقیقات پر ایک باب کی ضرورت تھی، کیونکہ اس کا تعلق بھی اسلامی دستور و نظام کے لیے ہونے والی کشمکش سے تھا۔ ۷۔ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء کے دور میں دینی اور سیاسی عناصر پر جو مظالم ہوئے اور طرح طرح کی بدتمیزیاں مختلف حضرات سے کی گئیں، اُن سب کا ایک خاکہ آنا چاہیے تھا۔ ۸۔ لیاقت باغ فائرنگ کا ذکر پڑھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ مؤرخ کے بیان کے مطابق عوام کو دہشت زدہ کرنا ہی مقصود نہ تھا بلکہ ایک مقصد یہ تھا کہ اگر وہاں زد میں آنے والے لوگ (خصوصاً پٹھان) کوئی جوابی حرکت کریں تو اُن کو ملیامیٹ کر دیا جائے، دوسرا یہ تھا کہ صوبہ سرحد میں ایک ایسا انتقامی جذبہ اُبھرے کہ پٹھانوں اور پنجابیوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جائے۔ داد کے قابل ہے ولی خان کی بصیرت اور پٹھانوں کا صبر کہ انھوں نے لیاقت باغ فائرنگ کے خطرناک تر مقاصد کو پورا نہ ہونے دیا۔ ۹۔ انتخابات ۱۹۷۷ء کے بعد احتجاجی تحریک، جس میں عوام، علما، وکلا، طلبہ اور خواتین نے شرکت کر کے ایک نئی مثال قائم کی۔ اُس کا ریکارڈ ایک اہم تاریخی کتاب میں محفوظ ہو جانا چاہیے تھا۔ ۱۰۔ بھٹو صاحب کی حکمتِ عملی سے پیدا ہونے والے بعض نتائج مؤرخ کے قلم کی زد سے باہر رہ گئے ہیں، مثلاً یہ کہ غریب طبقوں کو خوش حال لوگوں کے خلاف مشتعل کر کے اُن کے رشتۂ تعاون کو تباہ کر دیا گیا، یا یہ کہ کارخانوں اور دفتروں میں ایک طرف کام چوری بڑھی، افسر اور ماتحت کے درمیان ڈسپلن ختم ہوا، تنخواہوں اور اُجرتوں کو بڑھوانے کے لیے ہنگامے بڑھ گئے یا یہ کہ قواعد کو توڑ کر ملازمتیں چھیننے اور دلوانے، چہیتے ملازمین کو ترقی دلانے، بنکوں یا محکموں سے

فنڈز حاصل کرنے اور سرکاری ملازمین اور پولیس کو سیاسی اور ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ جس نے دفتری اور کاروباری زندگی میں خیانت کی آکاس بیل کو ہر طرف پھیلا دیا۔ ۱۱۔ اچھا ہوتا کہ کتاب کے آخر میں ضمیمہ اسماء و اعلام بھی ہوتا۔ ۱۲۔ میرا آخری مشورہ یہ ہے کہ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی نے مورخانہ منصب سے ذرا ہٹ کر "جمہوریت" کے متعلق جو باب لکھا ہے وہ اس کتاب میں ایک اضافہ بے جا بھی ہے اور میں اس باب کو کمزور بھی کہوں گا۔

اِن گذارشات کے ساتھ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ ایسی کتاب ہے کہ اسے مناسب تعلیمی مدارج میں نظریۂ پاکستان اور تاریخِ پاکستان کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اسے تعلیم گاہوں کی لائبریریوں میں موجود ہونا چاہیے، نیز وہ عوامی ادارے جو اسلامی نظام کی اقامت کے لیے کوشاں ہیں انہیں اپنے حلقوں میں اسے پھیلانا چاہیے، نیز دینی دارالمطالعوں میں بھی اس کو فراہم کیا جانا چاہیے۔

رُوداد پاکستان
از : پروفیسر محمود بریلوی
پتہ : ۲۲۳ / ۴ / ۳۲ اے ایریا ملیر کالونی۔ کراچی ۳۷
قیمت : ۳۵/- روپے

تاریخِ پاکستان کے متعلق یہ بھی ایک اہم کتاب ہے جسے تعلیم و تصنیف کے دائرے میں کام کرنے والے ہمارے ایک معروف دانشور نے محنت سے مرتب کیا ہے۔ اس میں پاکستان بننے سے قبل کا (آغاز ۱۸۵۷ء سے) ضروری تاریخی پس منظر بھی شامل ہے اور پاکستان کی اپنی تاریخ بھی۔ لفظ "پاکستان" سے لے کر نومبر ۱۹۷۹ء تک کے احوال پر حاوی — کتاب کا مرکزی حصہ پانچواں باب ہے جس میں پاکستان کی پُر آشوب ۲۵ سالہ تاریخ (اگست ۱۹۴۷ء تا دسمبر ۱۹۷۱ء) بیان ہوئی ہے۔ چھٹا باب بھٹو صاحب کے دورِ حکومت کا آئینہ دار ہے۔ آخری باب ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے شروع ہو کر نومبر ۱۹۷۹ء تک جاتا ہے۔

چار پانچ سو صفحے کے کام کو دو سو صفحوں سے کم میں کر دکھانا بڑی حیرت ناک کوشش ہے۔ جامعیت اور اختصار کی وجہ سے کتاب اس قابل ہے کہ اساتذہ، طلبہ اور عام مطالعہ کنندگان اسے حاصل کریں اور پڑھیں۔

مجلہ تعمیر — نظریہ پاکستان

زیر ادارت: اقبال، ماہر القادری نمبر

پیشکش: ادارہ تعمیر ادب کراچی

مجلہ تعمیر کے مدیران ڈاکٹر معین الدین عقیل، احمد انس، شیخ محبوب الٰہی اور شمیم احمد کے علاوہ ادارہ تعمیر ادب کراچی کے تمام معزز ارکان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے حالیہ ہند و پاک مشاعرہ کراچی (منعقدہ جہانگیر پارک) کے انتظام و انصرام کے علاوہ پیش نظر بیش قیمت ادبی مجلہ بہ موقع مشاعرہ شائع کر کے ایک طرف علم و ادب کی خدمت انجام دی اور دوسری طرف ماہر القادری مرحوم کی اعلیٰ خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

اردو ادب کی سلطنت پر اس وقت تک ایک ایسا استحصالی طبقہ مسلط رہا ہے جس نے بہت سے ادیبوں اور دانشوروں کو پوری طرح سر اٹھانے نہیں دیا، اور حد یہ ہے کہ کئی سربرآوردہ اور مسلمہ شاعر و ادیب ایسے ہیں کہ جو شمشاد قامت ہونے کے باوجود پوری طرح دکھائی نہیں دیتے۔ ماہر القادری بھی ان استحصالیوں کے سزا یافتگان میں سے ایک ہیں۔ یہ شخص جو زبان پر قادر، فن میں ماہر، تنقید میں محکم، علمی مباحث میں قوی، دینی حقائق و بصائر کا راز دان، توحید کا بے باک نقیب، نعت میں حبِ رسالت کا فانوس بردار، تغزل میں پیرایہ ہائے پاکیزہ میں معانیٔ تازہ کو سمونے والا، تحریک اسلامی کا نغمہ طراز، پاکستان کا سچا محب، ادب میں اسلامی اقدار کا پاسبان، خطوط کے باقاعدگی کے جواب دینے کے سامنے انشا ریں صاحبِ اسلوب، محفلوں میں لطائف کی پھلجھڑیاں چھوڑنے والا، مشاعرے لوٹ لے جانے والا ترنم ریز صاحبِ سخن، پھر پیارا انسان اور مخلص ساتھی — کیا مصنوعی طور پر ایسے شخص کے قامت رعنا کو کوتاہ کیا جا سکتا ہے؟

بہرحال پیش نظر مجلہ خاص میں ایک طرف اقبال کی تجلیات پیش کی گئی ہیں، دوسری طرف ماہر صاحب کا انعکاس۔ دونوں کا زاویۂ نظر ایک، منزل ایک، ہمت سفر ایک، جادہ ایک اور مقصدِ شعر و ادب ایک۔

اسلامی تصوف

از: سید احمد عروج قادری

ناشر: یونیورسل بکس

۴۴- اردو بازار لاہور

قیمت -/۲۷ روپے

اپنے موضوع اور مصنف کے لحاظ سے بڑی اہم کتاب ہے۔ سید احمد عروج قادری نے ملحدانہ تصوف اور فلسفیانہ تصوف کے بالمقابل کتاب و سنت کی بنیاد پر اسلامی تصوف (یا احسان یا تزکیہ نفس) کو نکھار کر پیش کیا ہے۔ حلقہ ہائے صوفیا کی متداول کتابوں میں سے صرف دو کو انہوں نے پیشِ نظر رکھا ہے: ۱- الرسالۃ القشیریہ اور (۲) احیاء علوم الدین۔ کتاب ۱۸ ابواب پر

پھیلی ہوئی ہے۔ سچے اسلامی تصوف کے لوازم پر الگ الگ تفصیلی بحث ہے اور مروّجہ مغالطوں کو صاف کرنے کی کوشش بھی ساتھ ساتھ کی گئی ہے۔
خدا کرے کہ پاکستانی ناشر نے یہ کتاب انڈیا کے مصنف کی باقاعدہ اجازت سے شائع کی ہو۔

مجاہدینِ ہزارہ
تالیف: داؤد کوثر
پتہ: نظیر دی ہٹی، مانسہرہ ہزارہ
قیمت: ۲۲/- روپے

ہزارہ کے ایک جواں سال صاحب قلم نے بڑے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ تحریک مجاہدین کے زیر اثر ہزارہ کے سرفروشوں کی داستانِ جہاد ہے جس کے ساتھ ساتھ غداروں اور مفسدوں کی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر چند کہ تحریک مجاہدین اور اس کے قائدین اور شہداء کے متعلق متعدد اچھی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر تحریک کا حق اُن علاقوں کے لکھنے والوں پر خاص طور پر آتا ہے کہ وہ آبادیوں، راستوں، جنگ کے میدانوں اور آثار و نشانات کو سامنے رکھ کر مقامی ذرائع سے جن حقیقتوں کی پردہ کشائی کر سکتے ہیں، ضرور کریں۔ اِس سلسلے کی یہ ایک اچھی کوشش ہے۔

محمد عمر مہاجر
مؤلفہ: فریبہ عقیل
ناشر: عصری مطبوعات۔ کراچی
پتہ: اے ۲۲۳ ۔ بلاک ڈی شمالی ناظم آباد۔ کراچی
قیمت: ۲۰/- روپے

ہم فریبہ عقیل کے الفاظ ہی سے مدد لیتے ہیں، لکھتی ہیں: "بابا کے انتقال کو اب ۳ سال ہو چکے...... بابا نے نہ اپنے مسودات کو حفاظت اور ترتیب سے رکھنے کا کبھی اہتمام کیا، اور نہ مطبوعہ تحریروں کو جمع کیا...... بابا کی تحریریں موضوعات کے لحاظ سے بہت متنوع ہیں۔ انھوں نے ادبی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے، تعارفی اور شخصی خاکے بھی تحریر کیے اور افسانے اور ڈرامے بھی لکھے...... بابا نے پاکستان آنے کے بعد زیادہ تر ریڈیو کے لیے ہی لکھا۔"

اب اندازہ کر لیجیے کہ کیسی وہ شاخِ شگوفہ در شگوفہ تھی جس کی اب صرف خوشبو باقی ہے ۔ تین ہجرتیں کرنے والے خاندان کے اس ممتاز فرد کے متعلق مسعود جاوید نے کیا خوب لکھا ہے۔ "اُن کی شخصیت میں عجم کا حُسنِ تخیل اور عرب کا سوزِ دروں تھا" اس کتاب میں مہاجر صاحب کی تحریریں، یعنی مضامین، افسانے،

ڈرامے اور خطوط وغیرہ جمع کیے گئے ہیں۔ ابھی توقع ہے کہ اور چیزیں بھی جمع ہو کر شائع ہوں گی۔

بائیبل، قرآن، سائنس
مصنف: موریس بکائیے
مترجم: ثناء الحق صدیقی
ناشر: ادارۃ القرآن
۴/۳۴ ڈی۔ گارڈن ویسٹ
نزد لسبیلہ چوک۔ کراچی ۵

ابتداءً یہ کتاب فرانسیسی میں لکھی گئی، پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ اب اُردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخی اور سائنسی دونوں حیثیتوں سے بائیبل کمزور ہے اور قرآن حکیم اتفاق سے مغرب کی عیسائی دنیا کا ایک شائع شدہ کتاب اِن حقیقتوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ جہاں جہاں اس کتاب میں کوئی کسر رہ گئی تھی یا اصل مؤلف کی سمجھ قرآنی حقائق کے لیے نارسا رہی ہے، وہاں مترجم نے مفید حاشیے لکھ دیے ہیں۔ ص ۳۰۶ سے جو مضمون شروع ہوا ہے، اس میں مندرج احادیث کے متعلق نوٹ نہ لکھنے سے کمی رہ گئی ہے۔ کتاب میں اُس دورِ تاریخ کا مواد بہت ہے جس سے بائیبل بحث کرتی ہے۔ صدیقی ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی نے تبلیغی مقاصد سے اِس کے پانچ سو نسخے خرید کر آدھی قیمت پر تقسیم کیے ہیں۔

نماز کے متعلق تین کتابیں

۱۔ "نمازِ مصطفیٰ" تالیف محمد یونس انور۔ ناشر مرکز اشاعت التوحید والسنۃ (مسجد شہداء لاہور) خوبصورت طباعت کے ساتھ کلماتِ نماز مع ترجمہ اور ضروری مسائل نماز۔ قیمت درج نہیں۔

۲۔ "نماز کی کتاب"۔ مرتبہ، مولانا محمد عبدالحلیم قاسمی جامعہ حنفیہ قاسمیہ۔ گلبرگ۔ منی مارکیٹ لاہور۔ یہ کتاب بھی خوبصورت طباعت کے ساتھ نماز کے کلمات متعلقہ ادعیہ، اذکار، اُن کے تراجم اور مسائل وضو و نماز وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اوّل الذکر سے ذرا زیادہ مفصل۔ صفحات ۱۶۰۔ قیمت ۱۲/- روپے

۳۔ "کتاب الصلوٰۃ" تالیف امام ابن قیم الجوزی۔ مترجم جناب عبدالرشید حنیف۔ ادارہ علوم اسلامی جھنگ صدر۔ قیمت درج نہیں۔ اوپر کی کتابوں سے زیادہ مفصل و علمی پایہ بلند۔ مگر اتنی سہل، سادہ اور عام فہم نہیں۔

ISLAM FOR CHILDREN

A GREAT FRIEND OF CHILDREN

ASSALAM U ALAIKUM

LOVE ALL CREATURES

MUSLIM NURSERY RHYMES

لندن کے ادارے اسلامک فاؤنڈیشن نے یہ کتابیں خاص طور پر بچوں کے لیے شائع کی ہیں۔ جن کا اوّلین مقصد تو یہ ہے کہ مغربی معاشروں میں پرورش پانے والے مسلم خاندانوں کے بچوں کو ملحدانہ یا نصرانی لٹریچر کی گرفت سے نکال کر ان کی ذہنی نشوونما کے لیے اسلامی لٹریچر فراہم کیا جائے۔ چھوٹے بچوں کی نفسیات کے مطابق قصے کہانیوں کا مؤثر پیرایہ، گیتوں میں ڈھلے ہوئے جذبات اور تصویری دلچسپیاں ضروری ہیں۔ زیرِ گفتگو کتابوں میں ان چیزوں کا لحاظ رکھ کر ایک امید افزا تجربہ کیا گیا ہے۔ ٹائٹل، طباعت، کاغذ اور گیٹ اپ اعلیٰ ہے۔ یہ لٹریچر خود ہمارے مشرقی ملکوں کے ان بچوں کے لیے بھی بہت مفید ہے جو یا تو انگریزی پرست خاندانوں کے نرغے میں ہیں یا جنہیں تعلیمی ضرورت سے انگریزی سیکھنی پڑتی ہے۔

تصاویر کے سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ بچوں کے لیے تعلیمی معلومات یا مطالعہ کو پرکشش بنانے کے لیے ایک خاص عمر تک مصوّر لٹریچر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن تصویریں دی جائیں تو یا تو نیچرل ہوں یا ان میں فنکارانہ بھونڈا پن پیدا کیا جائے۔ کسی حد تک کارٹونی انداز بھی مفید ہے۔ مگر بلاوجہ تصاویر کو مسخ کرنا یا ادھوری شکل دینا اچھا تاثر نہیں دیتا۔ پھر جب اس لٹریچر کو "اسلامی" بھی کہا جائے تو اس کے ساتھ ایسی تصاویر نہ ہوں جن کو اسلامی کہہ کر مذاق اڑایا جائے۔ براہِ راست طریق سے مذہبی اور دینی معلومات دینا بھی ضروری ہے۔ مگر یہی تصنیفی تکنیک نکالنی چاہیے کہ عام طریق سے کہانیاں لکھی جائیں، ان میں کہانی پن زیادہ ہو اور دینی قدریں واقعات اور گفتگوؤں میں اس طرح حل کر دی جائیں کہ بوجھ محسوس کیے بغیر بچے اپنے شوق سے انہیں پڑھیں۔ کوئی ذہین آدمی پرانے اور موجودہ اردو لٹریچر میں سے کہانیوں، لطیفوں اور نظموں کا ایسا انتخاب کرے جس میں سے انگریزی تراجم تیار کر لیے جائیں۔ فی الوقت جو کام سامنے آیا ہے وہ بہت امید افزا ہے۔

حدِ رجم کی شرعی حیثیت، از حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر الاعتصام لاہور۔ دار الدعوۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور۔ خوبصورت طباعت۔ قیمت ۵۰ء ۷ روپے۔

اسلام یا سوشلزم | از جناب سید اسعد گیلانی - اسلامی اکادمی، منصورہ - لاہور - قیمت -/۵ روپے

اللہ کے بارے میں میرے احساسات | پیشکش اسلامی جمعیت طالبات پاکستان — ۱۹۹ - شادباغ لاہور - خدا کے متعلق ۴۰ طالبات کے احساسات دلچسپ ادبی پیرائے میں - قیمت: -/۱۰ روپے

بائیبل کی تالیف و تحریف | از مولانا حکیم انیس احمد صدیقی - صدیقی ٹرسٹ - نسیم پلازا - نشتر روڈ، کراچی ۵ - تبلیغی کتابچوں کا سلسلہ نمبر ۱۱۷ - قیمت -/۳ روپے۔

اعجاز القرآن | جناب محمود علی اختر صاحب لفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) - نذیر سنز پبلشرز، ۴۰ اے اُردو بازار - لاہور - قیمت درج نہیں۔

اذان | یہ رسالہ برمنگھم سے مولانا نثار احمد کی نگرانی میں نکلتا ہے:-

پتہ:- 187 , ANDERTON ROAD , B'HAM UK B11 1ND -

چندہ سالانہ پاکستان کے لیے -/۱۵۰ روپے۔

اخبار اُردو | مقتدرہ قومی زبان کراچی کا نمائندہ ماہانہ رسالہ - مدیر مسئول آفتاب حسن - قیمت فی شمارہ -/۱ روپیہ - سالانہ چندہ دس روپے - پتہ: ۴۳ ڈی، بلاک اے، گلشن اقبال، کراچی ۴۷

تعلیمی پالیسی | مؤلفہ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی و پروفیسر احمد انس - تعلیمی پالیسی اور اس پر عملدرآمد کا دو سالہ جائزہ - ناشر - انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز ۳-۵۶ شالیمار - ۶/۴ اسلام آباد۔

دارالعلوم مدرسۃ الاسلام | مرتبہ: محمد یوسف آفندی، مہتمم دارالعلوم - مدرسۃ الاسلام - ہری پور رخاص ٹھٹھہ پاکر سندھ - ایک مفید اور ممتاز دینی درسگاہ کا تعارف۔

عیسائیت کی تبلیغ
ہمارا دشمن کون؟
اصلاح معاشرہ کیسے ہو؟
| تالیفات: محمد انور قریشی - عباسی مؤلف نے تین مسائل پر یہ تین پمفلٹ لکھے ہیں - ان میں خاص طور پر تبلیغ عیسائیت نامی پمفلٹ خاص اہمیت رکھتا ہے - اسے پڑھ کر حکام، علما، سیاسی لیڈر، نوجوان کارکن اور خواتین یہ اندازہ کریں کہ اندر ہی اندر عیسائیت کا پھیلاؤ کس رفتار سے ہو رہا ہے اور اس کے کیا اثرات پاکستان کی سیاست اور اسلامی نظام کے احیاء کی کوششوں پر پڑ سکتے ہیں - تینوں پمفلٹوں کا سلسلہ نمبر ۳۳، ۳۴، ۳۵ ہے - پتہ - انجمن خدام اسلام پاکستان - ماڈل ٹاؤن شپ - لاہور ۴۰

نصاب زکوٰۃ | از علامہ فقری صاحب ایم اے ایل ایل بی - پتہ - اسلامی ادارہ ادب و ثقافت پاکستان چاہ میراں لاہور

(بقیہ اشارات)

یعنی متذکرہ بالا منصوبے بہ عنوان " خدیجۃ الکبریٰ یونیورسٹی برائے خواتین" کی رُوح نکال کر اُسے سرے سے جسم ہی دوسرا دے دیا گیا ہے بلکہ صحیح تر یہ ہوگا کہ اُسے سرے سے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا ہے۔

یہ ہے سیکولر ذہنیت کی بیورو کریسی کا کمال!

آخر میں میری تجویز یہ ہے کہ خواتین یونیورسٹی کے حالیہ سرکاری منصوبے کو اسلامی کونسل کے حوالے کیا جائے، اور مناسب ہو تو اسے خدیجۃ الکبریٰ یونیورسٹی کا منصوبہ بھی دکھا دیا جائے۔ پھر اس سے دریافت کیا جائے کہ شرعاً وہ کس ڈھانچے کو پسند کرتی ہے۔ مفید یہ بھی ہوگا کہ مؤخر الذکر منصوبے کو بھی علما اور عوام کے استفادہ کے لیے شائع کر دیا جائے۔

مشرقی و مغربی

پچھلے شمارے میں اکتیس علما کی فہرست ایک نوجوان نے انگریزی سے ترجمہ کر کے فراہم کی اور جلدی میں کاپیاں تیار ہو کر پریس کے لیے چلی گئیں۔ سابق مشرقی پاکستان کے چار حضرات کو مغربی پاکستان سے متعلق قرار دیا گیا اور مغربی پاکستان میں سے دو کو مشرقی پاکستان سے منسوب کیا گیا۔ صحیح صورت یوں ہے۔

مولانا اطہر علی، مولانا راغب احسن، مولانا حبیب الرحمٰن سرسینہ شریف، مولانا ابوجعفر، یہ چاروں حضرات سابق مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔

دوسری طرف مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل، ہر دو بزرگ مغربی پاکستان کے رہنے والے تھے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی کو عبدالحمید لکھ دیا گیا ہے۔

ضروری تصحیح فرمالیں۔ (ادارہ)